ابن انشا کے سفرناموں کا تجزیاتی مطالعہ

(مقالہ برائے ایم فل)

مقالہ نگار

عبید الغفار

نگراں

پروفیسر محمد شاہد حسین

سینٹر آف انڈین لینگویجز،
اسکول آف لینگوج، لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز
جواہر لال نہرو یونیورسٹی
نئی دہلی ۱۱۰۰۶۷

۲۰۰۵ء

JAWAHAR LAL NEHRU UNIVERSITY
CENTRE OF INDIAN LANGUAGES
SCHOOL OF LANGUAGE, LITERATURE & CULTURE STUDIES
NEW DELHI-110067

DATE: 26/07/2005

DECLARATION

I declare that the work done in this dissertation entitled **" IBNE INSHA KE SAFAR NAMON KA TAJZIYATI MOTALEA"** by me is an original work and has not been previously submitted for any other degree in this or any other University/ Institution.

Obaidul Ghaffar

(OBAIDUL GHAFFAR)
Research scholar

M. S. Hus

PROF. MOHD.SHAHID HUSAIN
(SUPERVISOR)
CIL/SLL&CS/JNU

M. S. Hus

PROF. MOHD.SHAHID HUSAIN
(CHAIRPERSON)
CIL/SLL&CS/JNU

انتساب

بحضور قبلہ دل ونگاہ والد مہربان

جناب ابوالکلام (مرحوم)

فحبك راحتی فی کل حین

وذکرك مونسی فی کل حالٍ

پیش لفظ

باب اوّل: (۱۔۳۳)

اردو سفر ناموں کا ارتقا ابتدا سے ابن انشا تک

باب دوم: (۳۴۔۷۴)

ابن انشا کے سفر ناموں کا سیاسی اور سماجی پس منظر

باب سوم: (۷۵۔۱۰۳)

ابن انشا کے سفر ناموں کا تجزیاتی مطالعہ

حاصل کلام (۱۰۴۔۱۰۶)

کتابیات و رسائل (۱۰۷۔۱۰۹)

پیش لفظ

ابن انشا اردو ادب کا اہم نام ہے۔ ان کی شخصیت کثیر الجہات تھی۔ انہوں نے بیک وقت ادب کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کی جن میں منظومات بھی شامل ہیں اور منثورات بھی۔ شاعر کی حیثیت سے ان کا نام تعارف کا محتاج نہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے خوبصورت و شگفتہ نثر بھی لکھی ہے۔ ان کے سفرنامے ان کی رواں اور شگفتہ نثر کی زندہ مثال ہیں۔

جیسا کہ اردو ادب کے ہر سنجیدہ طالب علم پر یہ بات منکشف ہے کہ ابن انشا ایک ایسا نام ہے جس پر پوری توجہ دی جانی چاہئے تھی۔ اس کے باوجود ان پر ابھی تک خاطر خواہ کام نہیں ہوا ہے۔ کچھ حضرات نے ان کی شاعری کی طرف دھیان دیا ہے۔ لیکن ان کی نثری خدمات پر جس بیگانگی کے ساتھ نگاہ ڈالی گئی ہے وہ نظر انداز کرنے کے مترادف ہے، بالخصوص ان کے سفرنامے پر جو اردو ادب کا نادر اور بیش بہا خزانہ ہیں۔ یہی وہ بنیادی بات تھی جس کے باعث میں نے اپنے ایم۔فل کے مقالے کیلئے ابن انشا کے سفرناموں کو منتخب کیا۔

ابن انشا نے متواتر پانچ سفرنامے لکھے جو اردو کے اچھے سفرناموں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے سفرناموں کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا اسلوب عام سفرناموں سے بالکل جدا اور منفرد ہے۔ ابن انشا اپنے سفر کی روداد کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ قاری ہمہ تن گوش ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس میں دلچسپی کا سامان ہر جگہ موجود ہوتا ہے جس کے باعث قاری کی توجہ ہمیشہ ان کی روداد کی جانب مرکوز رہتی ہے۔ ابن انشا کی زبان بھی رواں ہے۔ ان کی زبان میں فطری رچاؤ پایا جاتا ہے جس کے باعث بھی قاری کا انہماک وارتکاز برقرار رہتا ہے۔

ابن انشا کے سبھی سفرناموں میں ان کے ظریفانہ مزاج کا بھرپور عکس ملتا ہے۔ وہ اپنے سفرناموں کو طنز و مزاح کے ذریعہ ایک ایسی پرلطف فضا سے ہمکنار کر دیتے ہیں جس میں زندگی کی تلخ و ترش سچائیاں بھی راحت افزا معلوم ہونے لگتی ہیں۔ یہ چیز اردو کے دوسرے سفرنامے نگاروں کے یہاں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

میں نے اپنے مقالے کو تین باب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں ابتداء سے لے کر ابن انشا تک کے سفرنامے کی ایک مختصر تاریخ بیان کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اردو سفرنامے کا ایک خاکہ ذہن میں مرتب ہو جائے جس کی روشنی میں ابن انشا کے سفرناموں کا مطالعہ کیا جا سکے۔

دوسرے باب میں ابن انشا کے سفرناموں کے ساتھ ساتھ اس عہد کے سماجی و سیاسی حالات پر بھی نظر ڈالی گئی ہے۔ اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کے سفرناموں میں عصری حسیت کی نوعیت کس انداز کی ہے، کیونکہ سفرنامہ صرف سفر کی روداد ہی سے عبارت نہیں ہوتا بلکہ اس کے پردے میں سفرنامہ نگار شاہد عصر کو بھی آئینہ دکھاتا ہے۔

تیسرے باب میں ابن انشا کے سفرناموں کا تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کے سفرناموں کی اساسی خصوصیات کون کون سی ہیں اور ساتھ میں سفرنامہ نگاری کی دنیا میں ابن انشا کی حیثیت کیا ہے۔

میں اپنے شفیق و مہربان استاد، پروفیسر محمد شاہد حسین کا شکریہ ادا کرنا فرض عین سمجھتا ہوں جنہوں نے مقالہ تحریر کرنے کے دوران قدم قدم پر میری رہنمائی فرمائی، ساتھ ہی تحقیق کی مبادیات سے بھی روشناس کرایا۔ ان کے علاوہ شعبہ کے دیگر اساتذہ کرام کا بھی شکریہ دل کی گہرائیوں سے ادا کرتا ہوں جن سے علم کی روشنی ملی۔

میں اپنے برادر معظم کا شکریہ ادا کرنا بھی ایک خوشگوار فریضہ تصور کرتا ہوں جنہوں نے ایک چھوٹے سے شہر سے جواہر لال نہرو یونیورسٹی جیسی عظیم درس گاہ میں تعلیم حاصل کرنے کیلئے بھیجا اور ہر قدم

پر میری امداد فرمائی۔ میں ان کے اس احسان کا بدلہ چکانے سے قاصر ہوں۔ اس کے صلے میں خدا انہیں دنیا اور آخرت میں سرفراز کرے۔ اپنی والدہ محترمہ کے احسان کا بدلہ کیسے چکا سکتا ہوں جن کی دعائے نیم شبی اور آہ سحر گاہی میری زندگی کے لئے عظیم نعمت ہے۔

اس مبارک موقع پر اپنے ہم جلیسوں اور دوستوں کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں جن کی صحبتوں سے ہر پل زندگی میں ایک نئی توانائی ملتی رہی ہے۔ کچھ دوست تو ایسے بھی ہیں جن کے تعاون کے بغیر میرا یہ مقالہ پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ پاتا۔ بالخصوص ظفر اللہ انصاری، وصی احمد اعظم انصاری، محمود عالم، عبدالحق کمال، شفقت کمال، منتظر قائم، اسد اللہ، محمد عمر، ارشد جمال، شارد جمال انصاری، فیضان سعید، محمد تنویر عبدالودود، خالدہ ادیب، امتیاز عالم، حیدر علی، متھن کمار اور ابھیشیک وغیرہ کے نام نامی قابل ذکر ہیں۔ اخیر میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میرا یہ مقالہ ایک طالب علمانہ کوشش ہے۔

عبید الغفار
۱۳۸، کاویری ہاسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی
نئی دہلی ۱۱۰۰۶۷

شیر محمد خاں ابن انشا

پیدائش: ۱۵ جون ۱۹۲۷ء

مقام پیدائش جالندھر (مشرقی پنجاب)

وفات: ۱۱ جنوری ۱۹۷۸ (لندن)

باب اول

اردو سفرناموں کا ارتقا

ابتدا سے ابن انشا تک

اردو سفرناموں کا ارتقا

(ابتدا سے ابن انشا تک)

یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ اس کائنات کی ہر شئے حرکت پذیر ہے۔ کیونکہ خود کائنات ہی مسلسل ایک رفتار میں رواں دواں ہے، اس لئے سکون کا تصور بے معنی ہے۔ چونکہ ہر چیز سرگرم سفر ہے۔ لہذا خود بخود زندگی بھی اس کے زمرے میں آجاتی ہے۔ زندگی کو بھی ایک ابدی اور لامتناہی سفر قرار دینا غلط ہرگز نہ ہوگا۔ زندگی سے متعلق تمام تحریریں اس اعتبار سے سفرنامہ ہی قرار پاتی ہیں خواہ وہ ادب کی کسی بھی صنف میں کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ تمام تر تحریرات زندگی نما سفر کی روداد ہیں۔

ادبی اصطلاح میں سفرنامہ اس بیانیہ صنف ادب کو کہتے ہیں جس میں مسافر یا سیاح اپنے دورانِ سفر یا اختتام پر اپنے ذاتی تجربات ومشاہدات، واردات وکیفیات اور تاثرات واحساسات کو نہایت ہی خوبصورتی سے پیش کرتا ہے۔ سفرنامے کی نوعیت کا انحصار اس بات پر بھی ہوتا ہے کہ سیاح کا کسی سفر سے متعلق کیا نقطہ نظر ہے، وہ جس طرح کے نقطۂ نظر کا حامل ہوگا، سفر سے وہ اسی طرح کے تاثرات اخذ کرے گا۔ یہ بات بھی کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ نقطہ نظر کا انحصار کسی سیاح کی شخصیت پر ہوتا ہے اس لئے ہم سفرنامے کو سیاح کی شخصیت کا آئینہ کہیں تو ہرگز غلط نہ ہوگا۔ ایک مسافر جب سفرنامہ لکھتا ہے تو اس کی آنکھیں محض ان حالات کی فوٹو گرافی تک محدود نہیں رہتیں بلکہ اس کی نظر ان تمام پہلوؤں کی تہہ تک جاتی ہے جس نے مسافر کو زیادہ متاثر کیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سفرنامے میں مسافر کے جذبۂ احساس، ردعمل کے ساتھ ساتھ اس کے ذاتی رائے کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہے جسے وہ اپنے علم کی روشنی میں سفرنامے کے قالب میں ڈھال کر رکھ لیتا ہے۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سفرنامے میں سیاح نے اپنے نقطۂ نظر، تاثرات اور سب سے بڑھ کر

اپنے فن کو بھی شامل کرلیا ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی کامیابی ہے اس لئے سفرنامے کی اہمیت وافادیت کا اعتراف کرنا لازمی ہوجاتا ہے۔

دراصل سفرنامہ عربی لفظ ''سفر'' سے مشتق ہے جس کے معنی مسافت طے کرنے یا قطع مسافت کے ہیں۔اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سفر اور سفرنامہ ایک ہی زنجیر کی دو کڑیاں ہیں۔دونوں کو ایک دوسرے سے ہرگز الگ نہیں کیا جاسکتا۔ چونکہ زندگی ایک مسلسل سفر کا نام ہے جس کا خاتمہ موت کے ساتھ ہی ہوتا ہے اس لئے خود بخود سفرنامے میں اس کا بیان لازمی ہوجاتا ہے۔جس دن سے انسان نے اس سرزمین پر قدم رکھا ہے اسی دن سے اس کا سفر شروع ہوگیا۔انسان اپنی زندگی کی تمام ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مسلسل سفر جاری رکھتا ہے جس کی وجہ سے انسانی قدر ومنزلت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں سفر پر جانے والے کو رشک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔اس کے خیر خواہ اس کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔اس کے علاوہ دنیا کے تمام مذاہب نہ صرف سفر کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ اس کی برکتوں کو بھی تفصیل سے پیش کرتے ہیں اور ہر انسان کو سفر سے سرفراز ہونے کی ترغیب بھی دیتے ہیں۔

سائنسی علوم نے انسان کے وجود کے آغاز وارتقاء سے متعلق جو حقائق پیش کئے ہیں وہ بھی ایک مکمل سفر ہی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ڈارون جو انسانی وجود کے آغاز وارتقا کی بات کرتا ہے اور سمندر کی گہرائی میں گھاس کے تنکے پر جنم لینے والی زندگی کو جب وہ مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے بنی آدم کی صورت تک پہنچتے ہوئے دکھاتا ہے، وہ بھی بنیادی طور پر سفر کی ہی داستان ہے۔قدرت نے انسان کے اندر ہر چیز کو پوشیدہ رکھا ہے اور اسے بروئے کار لانے کے لئے عملی جامہ پہنانا پڑا ہے۔انسان کے وجود کی اہمیت کے پیش نظر شاید سفر کرنا اور سفر کے وقت پیش آنے والے واقعات کو بیان کرنا روز ازل سے ہی انسان کا محبوب ترین مشغلہ رہا ہے۔علم کی پیاس انسان کو قدرت کی طرف سے ملنے والی تمام نعمتوں میں سب سے عظیم یا محبوب ترین نعمت ہے۔اپنی اسی پیاس کو بجھانے اور نامعلوم اشیاء کو جاننے کی خواہش نے آدم کو ان کا پہلا گناہ یعنی گندم کے دانے کو کھانے پر مجبور کیا۔سفر نے علم اور ایجادات کے انگنت کارنامے اور انسانی تہذیب وتمدن کے ارتقائی

سفر کو انجام تک پہنچایا۔ اس سلسلے میں قدسیہ قریشی کی رائے بڑی اہمیت رکھتی ہے:۔

''سفر کی ابتداء شاید روز ازل سے ہی ہوگئی تھی، جبکہ دنیا عالم وجود میں آئی، اس کے بعد رفتہ رفتہ آبادی بڑھتی گئی اور لوگ تلاش معاش اور مسکن کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے لگے۔ پھر ایک دور ایسا آیا کہ انسان کسب معاش میں ایسی زمین یا جگہ کی کھوج کرنے لگا جہاں سے اس کو ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لئے ضروری اشیاء مل سکیں۔ اس تلاش اور جستجو نے لوگوں کے گروہ کو نئی نئی سرزمین پر پہنچا دیا۔ جس کا نتیجہ رفتہ رفتہ یہ نکلا کہ گروہ قبیلوں میں تبدیل ہونے لگے، اور قبیلے اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مزید کھوج کرنے لگے۔ پھر ایک زمانہ آیا کہ یہی قبیلے قوموں میں بٹ گئے اور جب قوم بن گئی تو اس کی ضروریات اور بڑھ گئیں اور پھر مملکت کا ظہور عمل میں آیا۔ اس کے بعد مملکت کو وسیع کرنے اور دوسری مملکتوں سے تعلقات بنانے کے لئے لوگ ایک دوسرے کے ملک میں آنے جانے لگے۔ سفر کا پہلا ذریعہ پیدل اور دوسرا ذریعہ کشتی یا جہاز تھا۔ سفر سے لوگوں کو معلومات کے ذرائع وسیع ہونے لگے اور ایک ملک سے دوسرے ملک کو یہ بھی معلوم ہونے لگا کہ کس نے کس قسم کی ترقی کی ہے اور کس کس طرح آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس

مزید تلاش وجستجو کی بدولت روئے زمین کے وہ علاقے عالم
ظہور میں آئے جن کے بارے میں اس سے قبل لوگوں کو
معلوم بھی نہیں تھا۔" (۱)

اس اقتباس کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جب سے انسان نے دنیا میں قدم رکھا ہے تبھی سے وہ اپنی ضروریات کے سامان کی تلاش وجستجو میں اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ سفر کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک انسان کا وجود اس دنیا میں باقی ہے، اس سفر میں سیاح اور مسافر دونوں ہوں گے فرق صرف اتنا ہوگا کہ سیاح کا سفر رضا سے اختیار کیا جائے گا جبکہ مسافر کا سفر کسی کام کی غرض سے اختیار کیا ہوا ہوگا۔ یعنی کہ اس میں ایک سفر کا مقصد مسرت اور حظ حاصل کرنا ہوتا ہے جبکہ دوسرے کے سفر کا مقصد ایک مخصوص غرض وغایت ہوتا ہے۔

دنیائے ادب میں سفرنامے کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ جس میں بیک وقت تاریخ، سوانح، خودنوشت سوانح سبھی سما جاتے ہیں۔ اس کی بنیاد داستانوں اور قصوں کے برخلاف حقیقت نگاری پر رکھی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ سفرناموں میں تخیل کی بلند پروازیوں اور رومانی فضاؤں کی عکاسی کی کوئی جگہ نہیں، یہ دراصل سیاح کے عینی مشاہدہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ اپنے اندر کائنات کی تمام تر جزئیات کی عکاسی کرتا ہے۔ اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اس کے مختلف رنگوں میں پیش کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد برکت اللہ کی رائے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

"چنانچہ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو ادب میں سفرنامے
وہ بیانیہ صنف ہے جو کائنات کو بھی جزئیات کو اپنے اندر
سمونے کی صلاحیت رکھتی ہے اور زندگی کے بھی زاویوں اور

---

(۱) قدسیہ قریشی.....اردو سفرنامہ انیسویں صدی میں.....۱۹۸۷.....ص ۲۳-۲۲

پہلوؤں کو بتدریج قارئین کے سامنے ابھارتی جاتی ہے اور
محظوظ کر کے معلومات بھی فراہم کرتی ہے۔''(۱)

دراصل سفرنامہ ایک معلوماتی صنف ادب ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے اس ملک یا علاقے کی تاریخ وجغرافیائی حالات، موسم کے حالات، وہاں کی تہذیب وتمدن، مذہبی وثقافتی رجحان، وہاں کی معاشرت وصنعت وحرفت کے ساتھ ساتھ وہاں کی زبان وادب کے مکمل حالات کا پتہ چلتا ہے۔ بعض سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں انتظامیہ کے بارے میں بھی تفصیل سے لکھا ہے۔ مثلاً ملک کا انتظام، اس کے عدل وانصاف اور تجارت اس کے علاوہ مختلف قوموں کے وجود اور ان کی ترقی کے وسائل کے علم میں بھی یہ سفرنامے گراں قدر اضافہ کرتے ہیں۔ اپنی خصوصیات کی بدولت دنیائے ادب میں اسے ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ محمد حسین آزاد ''سیر ایران'' کے دیباچہ میں سفرنامہ کی خصوصیت کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

''سفرناموں میں انسانی زندگی کے ان گوشوں پر روشنی ڈالی
گئی ہے جو تاریخ ادب اور جغرافیہ کی دوسری کتابوں میں
تاریک چھوڑ دیئے گئے ہیں جیسے معاشرتی طور طریق،
رواج وعقائد، مذہبی تعلقات، تجارتی وصنعتی خصوصیات،
فرقے، زبانیں، شکل وصورت سفرناموں کی ایسی
خصوصیات ہیں جس نے اس کو جغرافیہ کی دوسری کتابوں
سے منفرد کر دیا ہے۔''(۲)

جبکہ ڈاکٹر بشریٰ رحمٰن کا کہنا ہے کہ:

''جغرافیائی نشیب وفراز تاریخی حوادث وہاں کی
زندگیوں کی نیرنگیوں اتار چڑھاو اور سیاسی پس

(۱) بشریٰ رحمٰن.....اردو کے غیر مذہبی سفرنامے۔ ۱۹۹۹.....ص ۴۴
(۲) بشریٰ رحمٰن.....اردو کے غیر مذہبی سفرنامے۔ ۱۹۹۹.....ص ۳۵۔۳۴

منظر کو سلیقہ مند انداز و عمدہ اسلوب میں ڈھال
دینا کہ اس میں زندگی کی روح آجائے اور اس
کی جیتی جاگتی تصویر پل بھر میں بن جائے سفر
نامہ کی بنیادی خصوصیت ہے۔"(۱)

اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سفرنامہ سیاح کے عہد کی زندہ جاوید تصویر ہے۔اس کے لئے سفرنامہ نگار کو اس عہد سے پوری واقفیت ضروری ہے کیونکہ اس کے علم میں جیسی تازگی، تجربے میں جیسی وسعت، مشاہدے میں جیسی قوت، خیال میں جیسا نیاپن اور فن میں جیسی پختگی ہوگی سفرنامہ بھی ویسا ہی کامیاب جامع، دلچسپ اور معلومات فراہم کرنے والا ہوگا۔

سفرنامہ چوں کہ عینی شاہد کے بیانات پر مبنی ہوتا ہے۔یعنی سیاح جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اسے ہی صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتا ہے جس کی وجہ سے اس کے بیانات میں کوئی کمی نہیں رہ جاتی۔سیاح جس دور میں بھی کسی ملک یا علاقے کا سفر کرتا ہے، وہ اس کے بارے میں لکھتا ہے جس سے اس جگہ، ملک یا علاقے کی تصویر ابھر کر سامنے آجاتی ہے یا اس کو یوں کہئے کہ سیاح اس دور کو اپنے الفاظ کے سانچے میں ڈھال کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیتا ہے۔مورخ بھی ایسی عینی شہادتوں کی تلاش و جستجو میں عمر صرف کرتا ہے۔اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ تاریخ نویسی میں سفرنامے کا بہت اہم رول رہا ہے یا اس کو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سفرنامہ تاریخ نویسی کیلئے گم شدہ کڑیوں کو فراہم کر کے اس کے سفر کو آگے بڑھاتا ہے۔

دنیا کی سب سے قدیم ترین تہذیبیں یونان اور ہندوستان کی ہیں۔ایک دور تھا جب دنیا جہالت کے اندھیرے میں ڈوبی پڑی تھی، اس وقت یہ دونوں تہذیبیں علم و ادب میں اپنے معراج کمال تک پہنچ چکی تھیں۔یہی وجہ ہے کہ علم و ادب کے تمام ابتدائی نقوش ہمیں یونان اور ہندوستان میں ملتے ہیں۔اس کے

---

(۱) بشریٰ رحمٰن.....اردو کے غیر مذہبی سفرنامے ۱۹۹۹.....ص ۴۸۔۴۷

متعلق ڈاکٹر خالد محمود لکھتے ہیں:

''ہندوستان جو ہمیشہ سے مذہبی فکر کا گہوارہ اور علم وادب کا مرکز رہا ہے تہذیبی اقدار میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھا۔اس سرزمین نے بڑے بڑے مذہبی رہنماؤں کو جنم دیا اور بلند پایہ عالم وفاضل اور مفکر پیدا کیے۔اس سرزمین کی علمی خدمات اور تہذیبی خصوصیات نے ساری دنیا میں ہندوستان کا نام روشن کیا۔دنیا کے قدیم سفرناموں کے مطالعے سے ہندوستان کی عظمت اور دوسرے ملکوں میں اس کی اہمیت اور توقیر کا اندازہ ہوتا ہے، جب ہم دنیا کے قدیم ترین تحریری سفر نامے کی تاریخ کا سراغ لگاتے ہوئے ماضی کے اوراق پلٹتے ہیں تو دنیا کے سب سے پہلے سفر نامے کی تخلیق کے اعزاز میں یونان کے ساتھ ہندوستان بھی اس طرح شریک نظر آتا ہے کہ یونانی سیاح میگستھنیز کا لکھا ہوا دنیا کا اولین دریافت شدہ باقاعدہ سفر نامہ "INDICA"(سفرنامہ ہندوستان) ہندوستان کے احوال سفر ہی پر مشتمل ہے''۔(۱)

جہاں تک یونان کے سفرنامے کا تعلق ہے تو وہاں کی ادبی تاریخ ہماری زیادہ رہنمائی نہیں کرتی۔ لیکن جو بھی ابتدائی نقوش ملتے ہیں ان سے ہمیں اس دور کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں پوری مدد ملتی ہے۔اس زمانے میں یونان کے لوگ کھیل کود اور ڈراموں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔جس کی وجہ

---

(۱) خالد محمود.....اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۹۵.....ص ۶۴۔۶۵

سے وہاں سفر زیادہ کرتے تھے، اس کے علاوہ یونان اور ہندوستان ہمیشہ سے ہی مذہبی فکر اور علم وادب کا مرکز رہے ہیں۔ ان دونوں ملکوں میں بڑے بڑے مفکر اور رہنما پیدا ہوئے۔ جن کا نام علم وادب کی دنیا میں تا قیامت باقی رہے گا۔ انہیں لوگوں کی وجہ سے آج بھی دنیا کی قدیم تہذیبوں میں یونان اور ہندوستان کے نام روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ جب ہم دنیا کے قدیم ترین سفرنامے کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو دنیا کے سب سے پہلے سفرنامے کی تخلیق سے یونان کے ساتھ ہندوستان کا نام بھی جڑا نظر آتا ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں سفرنامہ کی ابتداء میگستھینز کے (INDICA) ''سفرنامہ ہندوستان'' سے شروع ہوتی ہے۔ یہ یونان کے بادشاہ سکندر اعظم کے جانشین سیلوکس نکیٹر کے سفیر کی حیثیت سے چندر گپت موریہ کے دارالسلطنت پاٹلی پتر میں ۳۰۳ ق۔م۔ میں آیا تھا۔ ہندوستان میں اس کا قیام بہت دنوں تک رہا اس لیے اس نے ہندوستان کو ہر زاویے سے دیکھا۔ میگستھنیز نے اپنے سفرنامے میں اس دور کے سیاسی، سماجی، معاشرتی، تہذیبی، علمی اور اقتصادی حالات کا اتنا شاندار نقشہ کھینچا کہ اس دور کا ہندوستان ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مؤرخین اس کتاب کو بے حد معلوماتی قرار دیتے ہیں۔ پانچویں صدی عیسوی کی ابتداء میں چین کا ایک بدھ سفیر فاہیان ہندوستان آیا۔ یہ زمانہ گپت سلطنت کے عروج کا زمانہ تھا۔ فاہیان کے سفر کا مقصد بدھ مذہب کے مقدس مقامات اور خطبات کی تلاش وجستجو تھا۔ اس نے گپت سلطنت کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور علمی حالات کا مکمل جائزہ لیا ہے۔ وہ بدھ مذہب کی تعلیمات اور گپت تواریخ کو اپنی یادوں کی چادر میں سمیٹ کر لے گیا۔ اس کے بعد ساتویں صدی عیسوی میں راجہ ہرش وردھن کے دارالسلطنت میں چین کا سیاح ہونگ سانگ ہندوستان آیا۔ ہونگ سانگ کا سفرنامہ راجہ ہرش وردھن کی حکومت کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی عوامی زندگی وتہذیب وتمدن کا آئینہ دار ہے۔

چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی مسلمانوں کے لیے عہد زریں کا درجہ رکھتی ہے۔ اس عہد میں مسلمانوں کا خوب خوب عروج ہوا۔ چونکہ سیر وسیاحت عربوں کی گھٹی میں موجود تھی، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی جغرافیائی حدود سے نکل کر تمام دنیا کا سفر کیا۔ لیکن اسلام کی آمد کے بعد سیر وسیاحت کا دائرہ اور وسیع

ہوگیا،اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام نے اپنے عقائد وتعلیمات کی تبلیغ واشاعت کو سبھی مسلمانوں کے لئے باعث نجات بتایا تھا،مسلمانوں کا اولین سفر رسول اوران کے صحابہ کا سفر ہجرت ہے جس سے اسلامی سفر کی شروعات ہوتی ہے۔اس کے بعد یہ روایت آگے بڑھتی رہی۔سلیمان شرقی جو سلمان سوداگر کے نام سے بھی مشہور تھا، آٹھویں صدی عیسوی میں داخل ہوااوراپنے سفر کی روداد کو سفرنامے کی شکل میں قلمبند کیا۔سلیمان پہلا تاجر تھا جس نے ہندوستان کے ساحلی علاقوں کا بغور مشاہدہ کیا۔راجوں ومہاراجوں کے طرز حکومت اور تہذیب وتمدن کا چین کے حالات سے موازنہ کیا۔اس کے بعد ابوزید حسن کا نام آتا ہے جو تیسری صدی عیسوی میں فارس سے ہوتے ہوئے ہندوستان آئے اور یہاں سے چین گئے۔ابوزید حسن کے علاوہ ایک اور نادر سیاح ابوالحسن مسعودی ہے جو بغداد کے رہنے والے تھے۔مسعودی نے اپنی زندگی کے ۲۵ سال سیر وسیاحت میں گذارے۔انہوں نے اپنا سفر بغداد سے شروع کیا اور شام،روم،چین،افریقہ،تبت،لنکا ہوتے ہوئے ہندوستان آئے انہوں نے اپنی بلند پایہ تصنیف ''مروج الذہب'' میں گجرات کے پرتہار، بنگال کے پال، اور دکن کے راسٹرکوٹ کے درمیان جنگ کی داستان لکھی ہے۔مسعودی نے ہندوستان کے شہروں،دریاؤں اور یہاں کے سماج کی وضع قطع اور بودوباش کو بڑے شرح وبسط کے ساتھ اپنے سفرناموں میں جگہ دی ہے۔ اس کے علاوہ ابوریحان البیرونی کا نام بھی سرفہرست ہے جو محمود غزنوی کے دور حکومت میں ہندوستان آئے اور ۱۹۹۸ سے لیکر ۱۰۳۰ء تک یہاں قیام کیا اور ایک گرانقدر تصنیف ''کتاب الہند'' لکھی۔ جو ان کے سیر وسیاحت کی یادگار تصنیف ہے۔البیرونی ایک ایسے سیاح ہیں کہ جہاں جاتے علم وعرفان کی تلاش میں لگے رہتے اوراپنے کام کی چیزیں تلاش کرتے رہتے۔ان کی اسی تلاش وجستجو نے انہیں دنیا کی تاریخ میں ایک اہم مقام عطا کیا۔انہوں نے دوسرے سیاحوں سے ہٹ کو ہندوستان کو مناظر ومشاہدات میں کم اور کتابوں میں زیادہ تلاش کیا ہے اور شاید یہی ان کے ہندوستان کے سفر کا مقصد بھی تھا۔

ابن بطوطہ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، وہ محمد بن تغلق کے زمانے میں ہندوستان آیا۔۲۶ سال تک مسلسل سفر کرتا رہا۔اس نے یمن، حجاز، مصر، ترکی، روم، شام، ایران، بغداد، بخارا، بدخشاں،

افغانستان، ہندوستان اور چین کا سفر کیا۔اس نے علوم وفنون کی باقاعدہ تعلیم وتربیت حاصل کی تھی۔تصوف سے اسے والہانہ محبت تھی اور وہ حصول برکات کا بھی قائل تھا۔اسے ہر چیز سے دلچسپی تھی۔ابن بطوطہ سفر کرنے کا بہت شوقین تھا۔یہی وجہ ہے کہ اس نے بڑی سے بڑی مشکلات کا جواں مردی سے سامنا کیا۔دنیائے اسلام سے اسے بے پناہ محبت نے ہی سیاحت کا والہانہ شوق اس کے اندر پیدا کیا۔اس کی قوت ارادی کے آگے مخالف ہوا کا ہر جھونکا بے بس ہوکر رہ گیا۔وہ اتنا خوش نصیب سیاح تھا کہ جہاں بھی گیا اسے عزت سے نوازا گیا۔محمد بن تغلق اس سے اتنا متاثر تھا کہ اس نے اسے اپنا سفیر بنا کر چین بھیجا تھا۔ابن بطوطہ کا سفر نامہ ''عجائب الاسفار'' انسانی تاریخ کے ان گم شدہ اوراق کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جو ایک زمانے تک ہماری نظروں سے پوشیدہ رہے۔

پندرہویں صدی کے اواخر میں ہی یہ بات عام ہوچکی تھی کہ ہندوستان ''سونے کی چڑیا'' ہے۔لہذا اس سونے کی چڑیا کو دیکھنے کی خواہش اہل یورپ کے دل میں مچلتی رہی۔چنانچہ یونان، چین اور عرب کے بعد مغربی ممالک کے سیاحوں نے ہندوستان کا رخ کیا۔ہندوستانی سرزمین پر قدم رکھنے والا پہلا مغربی سیاح مارکو پولو ہے جو ۱۲۹۲ء میں ہندوستان آیا۔دوسرا یورپی سیاح واتھولومیوڈیاز تھا جس نے پرتگال کے بادشاہ لزبن کے کہنے پر ۱۴۸۶ء میں ہندوستان کے سفر پر روانہ ہوا جس نے اُتما تا انتر دیپ کی کھوج کی تھی۔یہ الگ بات ہے کہ وہ سمندری طوفان کی وجہ سے ہندوستان نہیں آسکا۔۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما ہندوستان آیا۔اس کے ساتھ ایک کثیر تعداد ہندوستان آئی اور ایک سال تک یہاں مقیم رہی۔

FRANCELAV FRIARS جسے دنیا کا اولین سیاح تسلیم کیا جاتا ہے اسے فرانس کے بادشاہ لوئس نے سیاحت کی غرض سے گرت خان کے یہاں بھیجا۔یہ پہلا یوروپی سیاح تھا جو بیاباں، جنگل، ریگستان اور کوہستان کو زیر کرتے ہوئے وسط ایشیا، منگولیا کے میدانی علاقے تک پہنچا۔اس نے سفر میں پیش آنے والی تمام مشکلات کا ذکر اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔تاریخ گواہ ہے کہ John Pin Decorpret نے جو سفر کیا اس سے دنیا حیرت زدہ ہوکر رہ گئی۔اگرچہ سیاحت نے اسے راستے میں ہی دم توڑنے پر مجبور

کر دیا۔ بہر حال چاہے جو بھی ہو مشرق میں سفر نامے کا آغاز مغرب سے پہلے ہوا۔ اس بات کی تصدیق عربی اور فارسی کی تحریروں سے ہوتی ہے۔

اگر ہم انگریزی کے سفر نامے کی شروعات کے بارے میں یہ کہیں کہ انگریزی کے سفر ناموں کی بنیاد اسپین کے سفر ناموں کے ترجمے سے ہوتی ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ بارہویں صدی سے انگریزی کے سفر نامے منظر عام پر آنے لگے۔ مس کک نامس لوآیٹ کے روزنامچے اس فہرست میں قابل ذکر ہیں۔ انگریزی سفر ناموں کو ایک نیا موڑ جانسن نے دیا اور سوئفٹ نے اس سے فائدہ اٹھا کر مزاحیہ سفر نامہ کی راہ ہموار کر دی۔ دنیا کی ہر زبان کے ادیبوں اور ہر خطے کے سیاحوں نے اس دنیا کو جس طرح سے پیش کیا ہے اس سے دنیا کی خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے۔ مشرق و مغرب کو ایک دوسرے سے روشناس کرانے میں BARTHOLOMAN OF CREMDNA اور WILLIAM OF RUBMK کا نام آتا ہے۔

سولہویں صدی میں جہاز رانی کی ابتداء نے سیاحوں میں دنیا دیکھنے کی خواہش دل میں جگا دی جس کی وجہ سے سیاحوں نے دنیا کو سمیٹ کر رکھ دیا۔ فرانسیسی سیاح ٹیونیز مختلف ملکوں کی سیاحت کرتے ہوئے چھ بار ہندوستان آیا۔ جیسے جیسے سہولتیں بڑھتی گئیں ویسے ویسے لوگوں کے اندر دنیا کو سمجھنے کی چاہت بھی بڑھتی گئی۔ اٹھارہویں صدی کا قابل ذکر سیاح Account the Preaunt Ottoman Impair ہے جس نے ۱۷۰۱ء میں روم کا سفر کیا۔ اس کے بعد Smallete Tobbas نے فرانس اور اٹلی کا سفر کیا۔ اس کے علاوہ سوتن ہنیری نے اسپین ہوتے ہوئے روم کا سفر کیا۔ اس میں ایک اہم نام فاسٹر جارج کا ہے جو افغانستان سے ہوتے ہوئے فارس اور روس گیا اس کا دوسرا سفر نامہ A Journey from Bengal to England اور A Journey from Bengal Under East Indias جو بحری سفر پر منحصر ہے۔ یورپ کے سیاحوں کا یہ جنون مذہبی بھی تھا ان کا مقصد اسلامی حکومت کو اندلس سے ختم کر دینے کے بعد افریقہ کے قبائلوں کے بیچ عیسائی مذہب کی تبلیغ کرنا تھا۔

ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے پرتگالی ہی نظر آتے ہیں جو تجارت کی

غرض سے ہندوستان آئے۔ مغل بادشاہ اکبر نے پرتگالیوں سے گہرے مراسم قائم کیے کیونکہ بحری تجارت میں اسی سے فائدہ تھا۔ اکبر کے وقت میں انگریز بھی تجارت کیلئے ہندوستان آئے۔ اور فرانسیسی بھی لیکن انگریزوں نے یکے بعد دیگرے سب کو زیر کر کے ہندوستان پر اپنا قبضہ جمالیا۔ اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ ہی مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہونے لگی اور بالآخر وہ منحوس گھڑی بھی آ گئی جب اس کا مکمل طور سے خاتمہ ہو گیا۔ مغلیہ سلطنت کے بعد انگریزی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ اس نئی سلطنت نے ہندوستان کو ایک نئی تہذیب وتمدن سے روشناس کرایا جس کا اثر سیاحوں پر بھی پڑا۔ اسی دور میں (یعنی کہ اٹھارہویں صدی جو ہندوستانی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتی ہے) اردو نثر کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ لیکن اس دور میں نثر لکھنے والوں کی تعداد معدودے چند تھی وہ بھی فارسی زبان کا سہارا لئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کے زیادہ تر سفرناموں میں فارسی کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ اردو سفرناموں میں فارسی کے اثرات کا ذکر بشریٰ رحمٰن یوں کرتی ہیں:

> ''اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلم دور حکومت میں ۱۸ویں صدی عیسوی میں اردو نثری ادب کا جنم ہو چکا تھا۔ مگر فارسی زبان کا اتنا غلبہ تھا کہ اردو زبان کے پروان چڑھنے، نشوونما کے امکانات نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس لیے اس دور کے زیادہ تر سفرنامے فارسی میں ہیں۔ ابوطالب کے قیام لندن سے انگریزی تہذیب وتمدن کا بہترین جائزہ ان کے سفرنامے میں موجود ہے۔ اٹھارہویں صدی کے ابتدائی دور میں اردو زبان لڑکھڑاتی ہوئی اس طرح آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ فورٹ ولیم کالج وجود میں آنے کے بعد اس زبان کے نشوونما میں بڑی سہولت مہیا ہو گئی۔''(۱)

---

(۱) بشریٰ رحمٰن.....اردو کے غیر مذہبی سفرنامے ۱۹۹۹.....ص ۱۰۶

اسی دور میں ہندوستانیوں کے دلوں میں لندن کی سیر وسیاحت کا شوق پیدا ہوااور اسی شوق نے ہندوستانیوں کوایک نئی سرزمین (جہاں اس سے پہلے وہ کبھی سیر وسیاحت کے لیے نہیں گئے) کی جانب قصد سفر کا جذبہ پیدا کر دیااور ہندوستانی باشندے مغرب کی طرف سفر پر نکلے۔ یہ الگ بات ہے کہ مغرب کا سفر کرنے میں زیادہ لوگوں کا مقصد سیاست رہا۔لیکن انہیں میں سے ایک بڑی تعداد نے اپنے سفر کے تاثرات کوقلم بند بھی کیا۔حج کے لیے گئے لوگوں نے بھی سفرنامے لکھے۔شروعات کے سفرنامے فارسی زبان میں تھے جواس دور کی اہم ادبی زبان تھی۔ ہندوستان سے دوسرے ملک سفر کرنے والے پرانے سیاحوں کی فہرست میں قباد بیگ، میر محمد حسین لندنی اور نواب کریم خاں کے نام اہم ہیں لیکن شیخ اعتصام الدین اور مرزا ابوطالب اصفہانی کے سفرنامے اور لوگوں سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

اردو میں سفرنامے کے آغاز وارتقا کی روایت کی ابتدا مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ہوتی ہے۔انیسویں صدی سے پہلے اگر ہم اردوسفرنامے کی روایت کے بارے میں جاننے کی کوشش کریں تو وہ بیکار ہے۔ ہندوستان میں جس وقت سفرنامہ لکھنے کی روایت شروع ہوئی اس وقت ملک میں سفرنامے کی روایت اہل فارس وانگریز دانشوروں کے زیر اثر خاصی مستحکم ہوچکی تھی۔ ابتدائی سفرنامہ نگار یوروپی یاوسط ایشیائی تھے جنہوں نے باہر سے آکر ہندوستان کے حالات زندگی کواپنے سفرناموں میں قلم بند کرلیا۔لیکن بعد میں جوسفرنامے ملتے ہیں انہیں ہندوستانیوں نے لکھا۔یہ وہ ہندوستانی تھے جو سیر وسیاحت کے واسطے ہندوستان سے باہر گئے تھے۔بہر حال جوبھی ہواردوسفرنامے کا آغاز انہیں زبانوں میں موجودسفرنامہ نگاری کی مضبوط روایتوں کے زیر اثر ہوا۔اس سے پہلے بھی اردوزبان وادب نے فارسی سے بے پناہ استفادہ کیا تھا۔چنانچہ یہ بات کہنا بیجانہ ہوگا کہ اردو میں دوسری اصناف کی طرح سفرنامے میں تجربہ ومشاہدہ انجام دینے کا سلسلہ بھی فارسی اورانگریزی کے زیر اثر ہی ہوا۔

فورٹ ولیم کالج سے عام فہم نثر لکھنے کا رواج شروع ہوجاتا ہے،لیکن کالج سے باہر ابھی تک فارسی اسلوب کا ہی بول بالا تھااس کی مثال میر امن کی ''باغ وبہار'' کے جواب میں لکھی گئی رجب علی بیگ سرور کی

تصنیف ''فسانۂ عجائب'' ہے۔کالج کے باہر دیباچے،تقریظیں اور سفرنامے فارسی میں لکھے جاتے تھے۔اردو کو فارسی کے سامنے درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا تھا۔لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اردو سفرنامے کے وجود میں آنے کیلئے جس ماحول کی ضرورت تھی یا جولسانی ونثری پیش رفت ناگزیر تھی اسے فورٹ ولیم کالج نے ہی ممکن بنایا۔فورٹ ولیم کالج کا یہ کمال ہے کہ اس نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اردو میں تالیف اور ترجمہ کے لیے جو کتابیں منتخب کیں وہ سفر کی روداد کو ہی بیان کرتی تھیں۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اردو لفظیات کا ایک ایسا نظم یا سرمایہ تیار ہوا جو سفر کی داستان بیان کرنے میں برتے جاتے تھے۔اگر ہم میر امن دہلوی کی ''باغ و بہار'' کا جائزہ لیں تو اس میں ہمیں سفرنامے کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔باغ و بہار ان درویشوں کا سفرنامہ ہے جنھوں نے مختلف ممالک کی ٹھوکریں کھائیں اور پھر گردش زمانہ نے ان کو ایک جگہ لاکر مجتمع کر دیا تا کہ اپنی زندگی کے سفر کے دکھ درد کو بانٹ سکیں نیز ایک دوسرے کو اپنے حالات سفر سے روشناس کرا سکیں۔باغ و بہار کی طرح اور بہت سی سفری داستانیں ہیں۔جیسے حیدر بخش حیدری کی ''آرائش محفل'' میں حاتم طائی کے سات سیاحتوں کا حال سفر،خلیل خاں اشک کی ''امیر حمزہ''،نہال چند لاہوری کی ''مذہب عشق'' بھی ہے۔اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اردو سفرنامے کی اولین روایت بالواسطہ طور پر فورٹ ولیم کالج کے مصنفین سے ہوتی ہے اور مشرقی زبانوں کے سفری داستانوں کو اردو میں ترجمہ کرنے کے بعد اس صنف ادب کے ابتدائی نقوش مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ مضبوط بنیاد بھی فراہم ہوئی۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے خالد محمود رقم طراز ہیں :۔

> ''یہاں فورٹ ولیم کالج کے نثری کارناموں کو کھینچ تان کر سفرنامہ قرار دینا منشا نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ دنیا بھر کی داستانوں نے جس طرح سیاحوں کے سفری احوال سے کسب فیض کیا ہے اسی طرح اردو سفرنامہ نگاری کے ابتدائی نقوش بھی ان داستانوں میں نظر آتے ہیں

جوفورٹ ولیم کالج میں تصنیف ہوئیں یا دوسری زبانوں
سے اردو میں ترجمہ کی گئیں۔ حالانکہ یہ کتابیں محض خیالی
یاقوت متخیلہ کے دوش پر کیے گئے سفر کی روداد سناتی ہیں اور
وہ بھی زبان غیر سے یعنی ترجمے کے ذریعے، اس لیے کسی
براہ راست اردو سفر نامے سے ان کا کوئی علاقہ نہیں۔ مگر
جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اردو سفر نامے کا خاکہ بنانے،
راستہ ہموار کرنے اور اردو سفر نامہ نگار کا ذہن تیار کرنے
میں ان تصنیفات کا بڑا ہاتھ ہے، انہیں کارناموں سے
حوصلہ پا کر اردو میں سفر نامہ نگاری کا آغاز ہوا۔'' (۱)

ان داستانوی سفر ناموں نے لوگوں کے اندر سفر نامہ لکھنے کا جذبہ پیدا کیا۔ شروع کے سفر نامے عربی اور فارسی میں لکھے گئے تھے۔ لیکن اردو جب عوامی زبان بن گئی تو لوگوں نے اردو میں سفر نامہ لکھنا شروع کیا۔ یہ بات درست ہے کہ یہ سفر نامے خطوط کی شکل میں ہوتے تھے۔ چاہے یہ غالبؔ کے خطوط ہوں یا دوسری شخصیتوں کے۔ لیکن اردو میں جو پہلا سفر نامہ وجود میں آیا وہ عجائبات فرنگ'' تاریخ یوسفی'' ہے۔ اس کا مصنف یوسف خاں کمبل پوش حیدر آبادی ہے۔ ویسے قدسیہ قریشی نے یوسف خاں کمبل پوش کے سفر نامہ تاریخ یوسفی کو اردو کا دوسرا سفر نامہ قرار دیا ہے اور اردو کا پہلا سفر نامہ شاعر نادر کی مثنوی ''مثنوی نادر'' کو بتایا ہے جو صحیح نہیں۔ ڈاکٹر ریاض احمد ریاض کی یہ رائے بہت حد تک صائب معلوم ہوتی ہے:

''بہر حال اردو سیاحت نگاری کی لگ بھگ ڈیڑھ سو سالہ
تاریخ میں یوسف خاں کمبل پوش ایک سچا سیاح نظر آتا ہے
جس کا سفر نامہ عجائب فرنگ اردو کا پہلا سفر نامہ ہے جسے

---

(۱) خالد محمود.....اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۹۵.....ص ۹۳

سفرناموں میں ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔اور
اس پر جدید سفرنامے کی اصطلاح کا اطلاق بہت حد تک ہوتا
ہے۔پچھلے سال ۱۹۸۳ء میں معروف محقق تحسین فراقی نے
اسے مقدمہ، حواشی اور دیگر تعلقات کے ساتھ بڑے
اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ان کے خیال میں عجائبات
فرنگ اپنی اولیت کے اعتبار سے نہیں ،اپنے اسلوب اور
لوازمہ کے اعتبار سے بھی ایک بے مثال سفر نامہ ہے۔
ایک سچے سیاح میں جو خصائص ہونے چاہئیں، یوسف
خان کمبل پوش ان سب کا جامع تھا۔عجائب وغرائب کو دیکھنے
کی سچی تڑپ، تجسس، تفحص، بے باکی، صاف گوئی اور
سلاست بہار وہ خصائص ہیں جن میں بہت کم سفرنامہ نگار
کمبل پوش کے حریف ہو سکتے ہیں۔ وہ دوران سیاحت
مناظر، مظاہر اور قوموں کے اوضاع واطوار کے ہموار
وناہموار سے گزرا، مگر بہت کم ایسا ہوا کہ اس نے اپنے قلم کو
موچ آنے دی ہو۔کمبل پوش سیاحت کی روح سے واقف تھا
اس نے جس منظر کو دیکھا اسے اپنے وجود کا حصہ بنالیا۔ بلکہ اس
میں ڈوب گیا"(۱)

کمبل پوش کے سفرنامے کے علاوہ اس زمانے میں بیاضوں کی شکل میں بھی سفرنامے لکھے گئے۔ اردو کے قدیم سفرناموں کی صنف میں کریم خاں کے "سیاحت نامہ" کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔اس سفر

---

(۱) ریاض احمد ریاض.....ابن انشا احوال وآثار ۱۹۸۸.....ص ۲۲۷

نامے میں نواب کریم خاں کے قیام لندن کی تفصیلات ہیں جسے عبادت بریلوی نے مرتب کیا ہے۔ کریم خاں کمبل پوش کے معاصر تھے۔ کمبل پوش نواب کریم خاں سے دوسال پہلے لندن گئے تھے۔ اور کریم خاں نے مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے سفیر کی حیثیت سے جھجھر کے مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں لندن کا سفر کیا تھا جب کہ کمبل پوش نے سیر وسیاحت کے لیے یہ سفر اختیار کیا تھا۔ ویسے تو سفر نامے، روزنامچے اور بیاضوں کی شکل میں لکھے جاتے رہے لیکن باقاعدہ سفر نامے کی دنیا میں ایک لمبے عرصے کی خاموشی کے بعد سرسید احمد خاں نے ایک مشن کے سلسلے میں ۱۸۶۹ء میں لندن کا سفر کیا اور جس کے نتیجے میں سفر نامہ ''مسافران لندن'' وجود میں آیا۔ اس کے بعد سرسید احمد خاں نے محمڈن اورینٹل کالج کے قیام کے سلسلے میں پنجاب کا سفر کیا، پنجاب کے سفر کو انہوں نے ''سفر پنجاب'' کے نام سے قلمبند کیا۔ اس طرح انہوں نے سفر نامے کسی مقصد کے تحت لکھے۔ ''مسافران لندن'' میں جہاں انہوں نے انگلستان کی ایک طرف تعریف کی ہے وہیں دوسری طرف اپنے ملک کی بدحالی، پسماندگی، جہالت، افلاس، ذہنی وتہذیبی پستی کا رونا رویا ہے۔ ان کے سفر نامہ ''مسافران لندن'' کا ایک اقتباس پیش ہے جو ان کی مقصد نگاری کا غلاف اوڑھے ہوئے ہے۔

> ''کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ ایک عورت حالت بیماری میں
> کتاب پڑھنے سے دل بہلائے آپ نے ہندوستان میں
> کسی امیر، کسی نواب، کسی راجہ، کسی مرد اشراف کو ایسی
> خصلت کا دیکھا ہے۔''(۱)

اس طرح سرسید نے سفر ناموں میں تہذیبی، علمی اور تعلیمی خصوصیات کو جگہ دی اور اس کے دامن کو وسیع کیا۔ سرسید نے سادہ نگاری کی جو تحریک چلائی تھی اس سے سفر نامہ میں اور بھی حسن پیدا ہو گیا۔ سرسید کے علاوہ جن سفر نامہ نگاروں نے اسے ایک مستحکم صنف کی حیثیت عطا کی ان میں نثار علی بیگ کا ''سفر نامہ یورپ''، مولانا جعفر تھانیسری کا ''کالا پانی''، محمد حسین آزاد کا ''سیر ایران'' اور انیسویں صدی میں وسط ایشیا

---

(۱) بشریٰ رحمٰن.....اردو کے غیر مذہبی سفر نامے ۱۹۹۹.....ص ۲۳۶

کی سیاحت نواب عمر علی خاں کے سفر نامے زادسفر، زادغریب، سفر نامہ آئینہ فرنگ، سفر نامہ رئیس، نیرنگ رنگون، نیرنگ چین، فرہنگ فرنگ، قند معزلی اور ارزنگ چین۔ ڈاکٹر شاہ علی سبزواری کا خوفناک دنیا نواب حامد علی خاں کا ''سیر حامدی'' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان سفرناموں میں دنیا کے مختلف علاقے مثلاً یورپ، مصر، شام، چین، افریقہ، ترکی، افغانستان کی تہذیب وتمدن، طرز معاشرت، رسم ورواج تعلیم وتربیت اور سیاسی، سماجی، اقتصادی حالات کا بیان نہایت ہی تفصیل سے ملتا ہے۔

مرزا نثار علی بیگ نے ''سفر نامہ یورپ'' کو روزنامچے کی شکل میں لکھا ہے۔ انہوں نے لندن کو ایک محقق و تنقید نگار دونوں کی حیثیت سے دیکھا اور اس کا مقابلہ ہندوستان سے کیا۔ انہوں نے اس سفر نامے میں لندن کے حالات، عادات واطوار، تہذیب وتمدن، طریقۂ تعلیم اور موسموں کا تفصیلی حال لکھا ہے۔ ان کی زبان نہایت ہی سلیس ہے جس میں انہوں نے مرقع کشی سے بھی کام لیا ہے۔ مولانا جعفر تھانیسری ''کالا پانی'' ان کی اٹھارہ سالہ زندگی کی داستان ہے جو انہوں نے جزائر انڈومان میں انگریزوں کی قید وبند میں گزاری۔ اس سفر نامے میں جہاں ایک طرف انگریزوں کے ظلم وستم کی داستان ہے وہیں دوسری طرف اس جزائر کی سماجی زندگی اور اس کے نشیب وفراز سے بھی وہ قاری کو روشناس کرانا چاہتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ ان کا یہ سفر نامہ ایک سماجی اور تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ محمد حسین آزاد کا سفر نامہ ''سیر ایران'' روزنامچے کی شکل میں ہے۔ ان کا یہ سفر علمی نوعیت کا ہے کیونکہ وہ فارسی زبان وادب کی لغت تیار کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس سفر نامے میں موسموں کا حال، کائنات کی تمام تر جزئیات اور وہاں کے باشندوں کی مزاجی کیفیت اور حاکموں کے رویے کو بھی اپنے سفر نامے میں جگہ دی ہے۔ انہوں نے اپنے سفر نامے کے لئے سحر زدہ اسلوب کو اپنایا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی کا سفر نامہ روم ومصر وشام کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے ۱۸۹۲ء میں پروفیسر آرنلڈ کے ہمراہ قسطنطنیہ کا سفر کیا اور چھ ماہ تک ترکی، مصر اور شام کا سفر کرتے رہے۔ یہ سفر دراصل انہوں نے اپنی مشہور ومعروف کتاب ''الفاروق'' کے مواد کی فراہمی کی غرض سے کیا تھا اس لئے اس سفر کو علمی سفر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس سفر نامے میں شبلی نے مذکورہ ممالک کی

تاریخی عمارتوں، تعلیمی اداروں اور کتب خانوں کا خاکہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کے سیاسی وسماجی حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔شبلی کے بعد اہم نام مولانا محمد علی کا ہے ان کے سفرنامے کا نام ''مولانا محمد علی کے یورپ کا سفر'' ہے اس میں انہوں نے یورپ کے حالات کا خوش اسلوبی سے جائزہ لیا ہے۔اردو ادب کی تاریخ کا ایک نہایت ہی معتبر نام علامہ اقبال کا بھی ہے۔انہوں نے تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ۱۹۰۵ء میں لندن کا سفر کیا تھا۔اپنے اس سفر کے دوران انہوں نے اپنے دوست کے نام دو خطوط لکھے پہلا خط عدن سے، دوسرا لندن سے یہ دونوں بہت ہی طویل خطوط ہیں اور ان کی حیثیت سفرنامے کی ہے۔اقبال کے ان دونوں خطوط سے متعلق بشریٰ رحمٰن لکھتی ہیں:۔

> ''۱۹۰۵ء میں علامہ اقبال اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے انگلستان گئے اس سفر کے دوران انہوں نے اپنے دوست کے نام دو خط لکھے۔ یہ عدن سے اور دوسرا لندن سے۔یہ دونوں خطوط طویل ہیں اور سفرنامے کی حیثیت رکھتے ہیں اس کو علامہ اقبال نے آستانہ محبوب الٰہی کی حاضری بمبئی کے قیام کے اور لندن تک کے سفر کے تاثرات وحالات قلم بند کیے ہیں۔دوسری اور تیسری گول میز کانفرنس لندن میں بھی اقبال نے شرکت کی تھی۔ان مواقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں اٹلی، فرانس، اسپین، سائپرس، مصر اور فلسطین کی بھی سیر کی اور ان سیاحتوں کی روداد ''سفرنامہ اقبال'' مرتبہ حمزہ فاروقی میں ملتی ہے۔سیاحت ہند میں بھی ہندوستان کے سفر کا تذکرہ ہے جو ۱۹۰۸ء میں کیا گیا اور اسے سید محمد ناصر نے ترتیب دیا''۔(۱)

---

(۱) بحوالہ۔خالد محمود.....اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۹۵.....ص ۱۸۶

بیسویں صدی سفرنامے کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔اس عہد میں اردو نثر اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔اگر چہ سرسید اور ان کے رفقاء نے اپنی تحریروں کے ذریعے اردو کے علمی خانے کو بہت حد تک مالا مال کیا اور اسے اپنے تعلیمی مقاصد کی تکمیل کے لئے مغربی علوم وفنون سے استفادہ کرنے کی ترغیب دی۔ جس سے ان کی کوششوں کو مزید استحکام حاصل ہوا۔ اس طرح سفر اور سفرنامے کی روایت کو بھی بڑھاوا ملتا رہا۔اب سفرنامے کی اہمیت، افادیت اور مقاصد پر زور دیا جانے لگا۔ روایتی انداز کے سفرنامے اپنے مقصد کو کبھی پس پشت نہیں ڈالتے۔ اور اس میں ادبی چاشنی کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔اس بات پر خاص دھیان دیا جاتا ہے کہ سیاح نے کیا دیکھا، اس کے تاثرات کیا ہیں۔بیسویں صدی میں ردعمل اور نقطہ نگاہ پر بھی خاص زور دیا جانے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت کے سفرناموں میں سفرنامہ نگار کے طرز اظہار کو خاص اہمیت دی جانے لگی۔ اور یہ دیکھا جانے لگا کہ اس کے طرز اظہار میں کس حد تک ندرت، لطافت اور ادبیت پائی جاتی ہے۔

بیسویں صدی سفرنامے کے لحاظ سے بہت ہی اہم صدی تصور کی جاتی ہے۔اس دور میں منشی محبوب عالم کے ''سفرنامہ یورپ'' کو خاص اہمیت حاصل ہے یہ اردو کا طویل ترین سفرنامہ ہے۔اس سفرنامے میں محبوب عالم نے یورپ کا نہایت ہی گہرائی سے مطالعہ کیا اور اس کی تمام تر کیفیات وجزئیات کو بڑے غور وخوض سے پیش کیا ہے۔ وہ کمبل پوش کی طرح یورپ کی چمک دمک سے مرعوب نہیں ہوتے بلکہ انہوں نے مغرب ومشرق کا موازنہ بڑے اخلاقی انداز میں کیا اور اپنے وطن کو یورپ کے مقابلے نہ پا کر انہیں تکلیف ضرور ہوئی مگر وہ ناامید نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے سفرناموں میں قوم کی غیرت وحمیت کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔سفرنامہ یورپ کے علاوہ انہوں نے ''سفرنامہ بغداد'' لکھا۔ جس میں بغداد کے حالات کا ذکر ہے۔ دونوں سفرناموں میں ان کی زبان نہایت ہی سادہ، سلیس اور بے تکلف ہے۔نواب فتح علی خاں بھی ایک اہم سفرنامہ نگار ہیں۔ انہیں سیاحت کا بہت شوق تھا لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے انہوں نے صرف انگلستان، فرانس اور اٹلی کا سفر کیا۔ان کا سفرنامہ ''سیاحت فتح خانی'' ہے۔اس کے ذریعے انگلستان سے ان کی حد درجہ مرعوبیت

اور احساس کمتری کا پتہ چلتا ہے۔ وہ وہاں کی ہر چیز کی تعریف کرتے ہیں۔ خالد محمود کا یہ جملہ درست ہے کہ انہوں نے آقاؤں کے وطن کو غلامانہ ذہن سے دیکھا ہے اس لئے ان کے سفرنامے کی محض تاریخی حیثیت ہے۔ اردو کے اہم سفرنامہ نگاروں میں عبدالقادر کو خاص مقام حاصل ہے۔ انہوں نے دو سفرنامے ''مقام خلافت'' اور ''سیاحت نامہ یورپ'' لکھا ہے۔ مقام خلافت میں اس وقت کے ترکی کی روداد ہے جب خلافت کا مسئلہ چل رہا تھا یہ سفرنامہ اس وقت کے مسلم ذہن کے ساتھ ساتھ اس کے بکھرے ہوئے شیرازہ کی تصویر پیش کرتا ہے جبکہ سفرنامہ یورپ ان کے سیاحانہ مزاج کی ترجمانی ہے۔ انہوں نے سفرنامے کے فن کو عروج بخشا اور اس کی روایت سے انحراف کرتے ہوئے سفر میں رونما ہونے والی مشکلات کے بجائے براہ راست منازل سفر کو اپنے سفرناموں کا موضوع بنایا۔ انہوں نے بیانیہ صنف کے ساتھ ساتھ خطوط اور روزنامچے کی تکنیک کا بھی استعمال کیا۔ اس عہد کے ایک اہم سفرنامہ نگار خواجہ غلام الثقلین ہیں جنہوں نے ''روزنامچہ سیاحت'' لکھا۔

TH-12639

اردو سفرنامے کی دنیا میں خواجہ حسن نظامی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انہوں نے ''سفرنامہ ہندوستان''، ''سیر دہلی''، ''سفرنامہ مصر و فلسطین وشام وحجاز'' اور ''سفرنامہ افغانستان'' لکھا جس میں سفرنامہ مصر و فلسطین وشام وحجاز کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ سفرنامے جغرافیائی، سیاسی وسماجی، معاشی واقتصادی حالات کے ساتھ ساتھ وہاں کے رسم ورواج، اخلاق وعادات اور تعلیم وتربیت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے سفرناموں کی واضح خصوصیت ان کا اصلاحی اور مبلغانہ انداز ہے۔ جس میں تصوف اور مذہبیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تخلیقی قوت کو بروئے کار لاکر سفر کے تاثرات بیان کئے اور اس طرح سفرنامے کو اس کی ایک نئی خصوصیت سے آگاہ کیا۔

محمد علی قصوری کا سفرنامہ ''مشاہدات کابل وباغستان'' اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ یہ سفرنامہ سیاسی مقاصد کے پیش نظر آپ بیتی کی شکل میں لکھا گیا۔ انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں اور مولانا عبیداللہ سندھی کے کہنے پر اس سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس میں انہوں نے افغانستان کے مایوس کن سیاسی،

Jawaharlal Nehru University Library

سماجی، معاشی، اقتصادی بحران کو محسوس کیا اور اسے اپنے سفرنامے میں قید کرلیا۔ اس کے علاوہ اس سفرنامے میں افغانستان کے قدرتی مناظر کی بھی خوب تصویریں ملتی ہیں۔ جہاں تک ان کے اسلوب کا سوال ہے تو وہ نہایت ہی سادہ و سلیس ہے۔ انہوں نے جگہ جگہ بے ساختگی، داخلی کیفیات اور ذہنی مشاہدات سے سفرنامے کو مزید تقویت پہنچائی ہے۔

قاضی ولی محمد نے ''سفرنامہ اندلس'' لکھ کر اردو سفرنامے کے ارتقا میں مزید اضافہ کیا۔ یہ سفرنامہ اندلس کی تاریخ ہے جو کسی زمانے میں مسلمانوں کے لئے باعث فخر تھا۔ قاضی ولی محمد نے اس سفرنامے کے ذریعے جہاں ایک طرف مسلمانوں کے شاندار ماضی کی یاد دلائی اور اس سے عقیدت کا اظہار کیا وہیں دوسری طرف دور حاضر میں اس کے زوال کا رونا بھی رویا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خالد محمود نے اسے آنسوؤں کی داستان سے تعبیر کیا۔ لیکن جہاں بھی انہیں اندلس کی تاریخی، جغرافیائی، سیاسی و سماجی اور تہذیبی حقائق کے ذکر سے فرصت ملی انہوں نے مناظر مقامات کی اچھی مثالیں پیش کیں۔ ان کی زبان بہت سادہ و سلیس ہے جس میں صداقت کے ساتھ ساتھ بے لاگ حقیقت نگاری ہے۔ ان کا انداز تحریر خاص کر ان مقامات پر حد درجہ جذباتی ہو جاتا ہے جہاں وہ ماضی کی تاریخ بیان کرتے ہیں۔

اس دور کے سفرنامہ نگاروں میں سید سلیمان ندوی کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ ان کا سفرنامہ ''سیر افغانستان'' تعلیمی نوعیت کا ہے۔ ان کا یہ سفرنامہ اس سفر کی روداد ہے جسے انہوں نے ۱۹۳۳ء میں شاہ افغانستان کی دعوت پر تعلیمی اصلاح کے سلسلے میں کیا تھا۔ اس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے افغانستان کے معاشی، سیاسی، تعلیمی اور ثقافتی حالات کو تاریخ کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی اور ماضی کا رشتہ حال سے استوار کیا ہے۔ کہیں انہوں نے انسانی فطرت کے وسیع کارناموں کی تعریفیں کی ہیں تو کہیں اس کی تنزلی کا رونا رویا ہے لیکن اس قسم کی کوششوں میں انہوں نے پند و نصائح یا وعظ و تلقین کے جملوں کا سہارا نہیں لیا بلکہ مناظر کے تضادات کے ذریعے اپنی باتوں کو واضح کیا ہے۔ علم و ادب سے والہانہ محبت نے ان کے قلم میں قوت گویائی عطا کی جس کی وجہ سے ان کے انداز و بیان میں لطافت دکھائی دیتی ہے۔ سید سلیمان ندوی کے

اسلوب پر علامہ شبلی کے اسلوب نگارش کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے۔

آزادی سے پیشتر نسوانی سفر نامہ نگاروں میں حسرت موہانی کی بیگم نشاط النساء صاحبہ نے اردو سفر نامہ نگاری کی تاریخ کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔ بیگم نشاط النساء نے مولانا کے ساتھ عراق کا سفر کیا اور ''سفر نامہ حجاز'' کے علاوہ ''سفر نامہ عراق'' لکھا۔ ان کے سفر نامے ان کی نسوانی نقطۂ نظر کی غمازی کرتے ہیں اور وہاں سے متعلق خواتین کے شوق، رہن سہن، طور طریق، آرائش وزیبائش اور تعلیم وتربیت کو اس کی تمام تر جزئیات کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ ان کی حساس اور سادہ طبیعت نے ان کے انداز بیان میں سادگی پیدا کر دی ہے۔ انہوں نے عراق کے طبقہ نسواں میں آزاد خیالی کو سراہا ہے کیونکہ وہ خود روشن خیال تھیں۔ ان کے یہاں مشرقی انداز اور اسلامی روایت کا عکس نظر آتا ہے۔ ان کے سفر ناموں سے مرد سیاحوں کے لکھے سفر ناموں کی خامیوں کوتاہیوں اور لاعلمیوں کی بہت حد تک بھر پائی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ مرد سیاحوں نے عورتوں کے متعلق ناقص، سطحی اور سرسری معلومات کو پیش کیا ہے جس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ مرد سیاحوں نے عورتوں پر برتری ثابت کرنے کی پرزور کوشش کی ہے۔

قاضی عبدالغفار کا سفر نامہ ''نقش فرنگ'' ہے۔ اس میں برطانیہ کے مختلف مقامات کی سیر وسیاحت اور وہاں کے ادیبوں اور دانشوروں سے تبادلۂ خیال کی روداد ہے۔ یہ سفر ہندوستانی سیاست دانوں اور دانشوروں کے ساتھ انہوں نے خلافت کے مسئلے پر برطانوی وزیر اعظم سے تبادلۂ خیال کی غرض سے کیا تھا۔ قاضی عبدالغفار نے سیاسی وقائع کے تحت برطانوی سیاست اور اس قوم کی نفسیات پر تبصرہ کیا ہے۔ ان کے تبصرے جرأت مندانہ اور عبرت آمیز ہیں۔ انہوں نے اس کے ذریعے عوام کی پسماندگی کو دور کرنے کی نصیحت کی ہے۔

خواجہ احمد عباس نے ۱۹۶۸ء میں بمبئی سے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ ان کا سفر نامہ ''مسافر کی ڈائری'' ۱۶ ملکوں کے سفر کی داستان ہے۔ وہ اشتراکی نظام کے علم بردار تھے جس کا عکس ان کے اس سفر نامے میں دکھائی دیتا ہے۔ اشتراکیت نے ان کے انداز بیان میں تلخی اور تیکھے پن کا رجحان پیدا کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مناظر فطرت کی پوری طرح عکاسی نہیں کر پائے۔ انہوں نے مغرب کی کھوکھلی تہذیب، لوٹ کھسوٹ اور

دھوکا دھڑی پر ٹکی ہوئی عمارت کا نقشہ کھینچا ہے جو انسانیت کا خون کر رہی ہے۔ یہی نہیں اس سفر نامے میں انہوں نے دوسری جنگ عظیم سے پیدا ہونے والے تشویش ناک حالات سے دنیا کو باخبر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا اسلوب سادہ و سلیس ہے۔

نازلی رفیعہ سلطانہ بیگم کا سفر نامہ ''سیر یورپ'' ہے جو ان کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ اس سفر نامے میں رفیعہ بیگم نے ملک کی پسماندگی، بدحالی، جہالت، تہذیب و تمدن کی کمی کی روداد بیان کرتے ہوئے عوام کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ دراصل ایک معلوماتی سفر نامہ ہے جس میں ان تمام باتوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی جس سے ملک و قوم کو فائدہ ہو۔ اور آنے والی نسلیں اپنی منزل مقصود کی طرف آگے بڑھ سکیں۔ نازلی بیگم کا یہ سفر ۲۵ اپریل ۱۹۰۸ء کو ریاست جزرہ سے شروع ہوا۔ اس سفر نامے میں ایک مشرقی خاتون کے فطری عنصر کے رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ جن میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک ہندوستانی عورت میں پائی جاتی ہیں جو ان کے نسوانی مزاج کی دین ہیں۔ ان کے سفر ناموں میں یورپ کی خواتین کے خدوخال، ان کی آرائش و زیبائش کا ذکر نہایت ہی تفصیل سے ہوا ہے۔ انہوں نے وہاں کی گلیوں، شہروں اور شخصیتوں اور مناظر فطرت کا بہت قریب سے مطالعہ کیا تھا لیکن ہندوستانی مزاج نے ان کو بے تکلف نہ ہونے دیا جس کی وجہ سے ان کے سفر ناموں میں بیباک پن نہیں ملتا۔

سفر نامہ ''لندن سے آداب عرض'' آغا اشرف کی تخلیق ہے۔ یہ سفر نامہ دوسری جنگ عظیم کی روداد ہے ہٹلر کی انانیت اور سرکشی نے اس جنگ عظیم کی بنیاد ڈالی۔ اس جنگ نے دنیا میں معاشی اور سیاسی بحران پیدا کر دیا جس کی وجہ سے لندن کا نقشہ بدل گیا۔ اشرف نے اپنے سفر نامے میں ایک طرف جہاں جنگ کی ہولناکیوں کا ذکر کیا ہے وہیں دوسری طرف کرسمس کی خوشی میں جشن کی منظر کشی کی ہے جس کی وجہ سے انگریزوں کی ذہنیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ گویا انہوں نے انگریزوں کی دوطرفہ باتوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ ''لندن سے آداب عرض'' دراصل دوسری جنگ عظیم کے دوران لندن کی سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تہذیبی زندگی کا نقشہ ہے۔ آغا اشرف نے اس سفر نامہ میں افریقہ کے گوروں اور کالوں کے بیچ تفریق کا تذکرہ کیا ہے۔

عتیق احمد صدیقی نے سفرنامہ ''یادوں کے سائے'' لکھ کر شہرت حاصل کی۔ یہ سفرنامہ تقریبا پچیس سالہ عرصے پر مشتمل ہے۔اس سفرنامے میں نثر کی تمام ہیئتیں موجود ہیں چاہے وہ خودنوشت ہو، ناول، افسانہ، یا سفرنامہ ہو۔ یہ عجیب کشمکش ہے کہ اسے دنیا کی کسی صنف میں رکھا جائے۔ حالانکہ یہ بات طے شدہ ہے کہ نہ ہی یہ افسانہ ہے اور نہ ناول بلکہ یہ سفرنامہ ہے۔ سفرنامہ ''یادوں کے سائے'' میں قاہرہ کی سیر وسیاحت کا ذکر ہے۔انہوں نے قاہرہ سے عراق وایران کا سفر کیا تھا۔عتیق صدیقی اپنے عہد کی سیاسی، سماجی، معاشرتی تصویر کو اپنے سفرنامے میں جگہ دیتے ہیں۔اس سفرنامے میں ترک، عرب اور ہندوستان کی طرز معاشرت کی جھلک ملتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ایران کے طلبہ کی ملک سے لاعلمی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، ان کے انداز بیان میں شعریت ہے۔تشبیہات واستعارات کا انہوں نے بخوبی استعمال کیا ہے۔

موجودہ دور میں بھی کئی خوبصورت سفرنامے منظر عام پر آئے جس نے اردو سفرنامے کے ارتقاء میں نمایاں کردار ادا کیا۔مگر طوالت کی وجہ سے ان کا تفصیلی ذکر اس مختصر سے مقالے میں ممکن نہیں اس لئے یہاں ان سفرنامہ نگاروں اوران کے سفرناموں کا سرسری ذکر کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں۔

اس عہد کے دوسرے اہم سفرناموں میں عبدالماجد دریابادی کا ''سفرنامہ حجاز'' سید ابوظفر ندوی کا ''سفرنامہ برہما'' بدرالاسلام کا ''حقیقت جاپان''، نواب فتح علی خاں کا ''سیاحت فتح خانی'' مولانا عبیداللہ سندھی کا ''کابل میں سات سال''، حسین احمد بیگ کا ''پردیس کی باتیں''، شاہ بانو کا ''سیاحت سلطانی''، ڈاکٹر محمد حسین کا ''۱۹۰۷ء کا جاپان''، مولانا حسرت موہانی کا ''سفرنامۂ عراق''، علی عرفانی کا ''مشاہدات عرفانی''، عطیہ فیضی کا ''زمانۂ تحصیل''، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن کا ''سفرنامۂ شیخ الہند''، غازی امان اللہ شاہ افغانستان کا ''سفرنامہ شاہ افغانستان''، مولوی عبدالرحمٰن امرتسری کا ''سفرنامہ بلاد اسلامیہ''، طالب الہ آبادی کا ''سفرنامہ عراق''، پنڈت ٹھاکر دت کا ''سیر یورپ''، نواب لیاقت جنگ کا ''سفرنامہ یورپ وامریکہ''، عشرت علی صدیقی کا ''لینن گراڈ تا سمرقند''، عبدالخلاق ''سیر برہما''، نواب محمد ظہیر الدین کا ''سیاحت نامہ''، سر رضا علی کا ''اعمال نامہ''، ہارون خاں شیرانی کا ''یورپ جنگ سے پہلے''، محمد اسد کا ''طوفان سے ساحل تک'' اور مولانا حسین الدین خاموش کا ''مرقع حجاز'' کافی اہم ہیں۔ جنہوں نے

اس کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

زندگی کا کارواں ہر دم آگے بڑھتا رہتا ہے اور اس کی نظر کے سامنے نئے افق نمودار ہوتے رہتے ہیں جن کی آب و تاب اسے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ کوئی پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھے تو دور بہت اندھیرا نظر آتا ہے۔ پیچھے چھوٹی ہوئی منزلیں کیسی ہی کیوں نہ ہوں انسان کو بہت عزیز ہوتی ہیں۔ اب لامحالہ ایک ہی صورت رہ جاتی ہے۔ ماضی کی تھوڑی بہت دل پسند متاع کو سینے سے لگا کر اور نئے افق سے تھوڑا سا اجالا مانگ کر اس کی روشنی میں نئی منزل کی طرف قدم بڑھایا جائے۔ جہاں تک اردو سفر ناموں میں دور جدید کا سوال ہے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تقسیم ہند کے بعد سے اردو سفر نامہ کے جدید دور کی شروعات ہو جاتی ہے۔ عصر حاضر میں سفر نامے کی سمت و رفتار پر روشنی ڈالتے ہوئے خالد محمود فرماتے ہیں:۔

> ''عصر حاضر میں سفر نامے کی سمت و رفتار کا جائزہ لیتے ہوئے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اردو سفر نامے نے ترقی کی کئی منزلیں طے کی ہیں، جہاں تک اسلوب اور تکنیک کا سوال ہے یہ صنف بڑی حد تک قدیم روش پر گامزن رہی، لیکن فنی صلاحیت، علمی استعداد اور تخلیقی شعور رکھنے والوں کے لیے تمام راہیں کبھی مسدود نہیں ہوتیں، وہ ہر جگہ ارتقا کی گنجائش نکال لیتے ہیں، چنانچہ عصر رواں کا سفر نامہ تجربات و مشاہدات کی رنگا رنگی اور تنوع کے ساتھ سفر نامہ نگار کے جذبات و احساسات اور ردعمل کی زبان بن گیا ہے۔ آج کا سفر نامہ نگار صرف تاریخی اور جغرافیائی سطح پر معلومات جمع کرنے کا قائل نہیں بلکہ تخلیق کی فنی چابکدستی کے ساتھ اپنی بات کو اس

خوبی سے پیش کرتا ہے کہ قاری بھی سفر نامہ نگار کے
تجربات ومشاہدات میں شریک ہوجاتا ہے۔ اس کے
برعکس جوسفر نامے روکھے، پھیکے اور غیر ادبی انداز میں
صرف معلومات فراہم کرنے کی غرض سے لکھے گئے ہیں
ان کی حیثیت گائڈ بکوں سے زیادہ نہیں۔ اس قبیل کے
سفرنامے قبول عام کی سند حاصل نہیں کرتے۔''(۱)

وقت وحالات جیسے جیسے خوش گوار ہوتے گئے ویسے ویسے سفر نامہ بھی ترقی کی راہ پر گامزن ہوتا گیا۔ تقسیم ہند کے بعد جدید سائنسی ٹیکنالوجی نے انقلاب برپا کردیا۔ اب لوگوں کو کسی بھی ملک کی تاریخی، جغرافیائی، تہذیبی، ثقافتی، تمدنی اور سماجی حالات کی تفصیلات کے لئے سفرناموں پر منحصر نہیں ہونا پڑتا بلکہ اس کے لئے مختلف ذرائع دستیاب تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے سفرناموں میں فنی اور موضوعاتی دونوں سطح پر زبردست تبدیلی رونما ہوئی۔ اب سفرنامہ بیانیہ اور معلوماتی ادب نہ رہ کر ذاتی تأثرات، جذبات واحساسات اور نجی ردعمل کا اظہار بن گیا۔ گویا کہ سفرنامہ جگ بیتی کے بجائے آپ بیتی بن گیا۔ اس دور میں تخلیقی انداز پر زور دیا جانے لگا اور آنکھوں دیکھی حقیقتوں اور سچائیوں کو ادبی انداز میں پیش کرنے کا چلن عام ہوا۔ اس دور کے سفرناموں نے پرانی بنیادی روایتوں کی حد بندیوں کو توڑ کر اس کا رشتہ ادب کی دوسری شاخوں سے جوڑ دیا۔ اب سفرناموں میں فکشن کے بھی اثرات دیکھے جانے لگے۔ اس طرح سفرناموں میں افسانوی رنگ کے اتار چڑھاو نے اسے مقبول عام صنف کا درجہ عطا کردیا۔

فنی اعتبار سے سفرنامہ لکھنے کے لئے روزنامچوں، یادداشتوں اور خطوط کی قدیم تکنیک کا استعمال کیا گیا مگر اس میں انداز بیان کو خاص اہمیت دی گئی۔ خطوط کی شکل میں لکھے سفرناموں میں سفرنامہ اقبال، تہذیب یورپ کے چند مناظر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ محمد علی جوہر کا ''زندگی کی آخری شب''، مولانا

---

(۱) خالد محمود.....اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۹۵.....ص ۲۳۷

شوکت علی کا ''سفر انگلستان' پطرس بخاری کا لندن سفرنامے اسی تکنیک کے تحت لکھے گئے جبکہ شفیق الرحمٰن کا برساتی، نورالزماں احمد کا لندن کی ایک شام سوانحی شکل میں منظر عام پر آئے۔ اس کے علاوہ ''حج نامے'' کی شکل میں مولانا ماجد دریابادی کا سفر حجاز، منشی امیر احمد علوی کا سفر سعادت، مولانا ابوالحسن ندوی کا مشرق وسطیٰ میں کیا دیکھا بھی قابل ذکر ہیں۔ اتنا ہی نہیں کچھ سفرناموں میں سیاسی رنگ بھی جھلکتا ہے جیسے کرشن چندر کا ''اور گاندھی جی بادشاہ کے دیش میں''۔

تقسیم ہند کے بعد جو سفرنامے منظر عام پر آئے ان میں وہ خوبیاں نہیں جو یوسف خاں کمبل پوش کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ ہاں کچھ لوگوں کے یہاں ابھی بھی روایتی انداز کے سفرنامے دیکھنے کو ملتے ہیں جیسے اصفہانی اور ہنری پامر، ہرکشن پرشاد، سر عبدالقادر اور ڈاکٹر مختارالدین۔

تقسیم ہند کے بعد کے اردو سفرناموں کی تاریخ میں سید احتشام حسین کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے سفرنامہ ''ساحل اور سمندر'' کو ۱۹۵۴ء میں ترتیب دیا۔ یہ سفرنامہ ڈائری کی شکل میں ہے جو دس مہینے کے طویل سفر کی داستان ہے۔ اس میں انہوں نے لندن، پیرس کے سفری احوال کا تفصیلی احاطہ کیا ہے۔ اس سفرنامے میں نظر اور نظریے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ احتشام حسین چونکہ اشتراکی نظریے کے حامل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے امریکہ کو اسی عینک سے دیکھا اور صحیح طور پر سفرنامے کے ساتھ انصاف نہیں کر پائے جبکہ اچھے سفرنامہ نگار کے لئے غیر جانب دار ہونا بہت ضروری ہے۔ چونکہ ان کے سفر کا آخری حصہ سمندر و ساحل سے بھرا پڑا ہے اسی لئے اس کا نام ساحل اور سمندر رکھا۔ اس سفرنامہ میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ بہت ہی سادہ و سلیس ہے اور قاری کو دلبستگی کا سامان فراہم کرتی ہے۔

صالحہ عابد حسین کا نام بھی سفرناموں کے لئے کافی اہم ہے۔ ان کا سفرنامہ ''سفر زندگی کے لئے سوز و ساز'' کافی اہم ہے۔ جو صالحہ عابد حسین کی خودنوشت سوانح حیات کا ایک حصہ ہے۔ جسمیں انہوں نے ملکی اور غیر ملکی حالاتِ سفر کو قلم بند کیا ہے۔ اس میں حج بیت اللہ، کربلا اور نجف اشرف کی زیارت کا ذکر ہے۔ ان کے سفرنامے میں ناول کا انداز پایا جاتا ہے۔ ان کی تحریر میں سادگی، سچائی اور بے ساختگی ایک طاقت بن کر

ابھرتی اور قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ ان کے یہاں نسوانی لہجے میں اپنائیت، محبت اور ملائمیت نمایاں ہے۔ ان کے یہاں صرف 'ایلورا' کی گپھاؤں یا کشمیر کے مناظر فطرت کا ہی ذکر نہیں بلکہ آثار قدیمہ اچھی عمارتوں عبادت گاہوں کا بھی حسین ذکر ملتا ہے۔

خواجہ غلام السیدین کا شمار اس عہد کے اہم سفر نامہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کئی سفر کئے اور تمام سفر کی روداد کو اپنے سفر ناموں میں قید کر لیا۔ ان کا سفر محض تفریحی نہیں تھا بلکہ اپنی تعلیم اور منصب کی ادائیگی کے تحت تھا۔ اسی لئے ان کے سفر ناموں سے ان کی معلمانہ مزاج کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ان کا سفر نامہ ''دنیا میرا گاؤں'' ہے جسے سید فرحت حسین نے شائع کروایا تھا۔ ان کا یہ سفر نامہ ان کے سفر ایران کے احوال کو بیان کرتا ہے۔ اس میں انہوں نے ایران کی تہذیب وتمدن کی خوبصورت تصویر کشی کی۔ ''دنیا میرا گاؤں'' میں دراصل ان کی ذہنی، فکری اور تہذیبی میلانات کی پوری غمازی ہے۔ خواجہ صاحب مغربی تہذیب کے مقابلے میں مشرقی تہذیب کو برتر قرار دیتے ہیں۔ ان کے سفر ناموں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انسانیت کی تلاش وجستجو ملتی ہے اور وہ بے جان مناظر کے بجائے نیکی وبھلائی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ گویا ان کی نظر صرف اور صرف انسانی ذات سے تعلق رکھتی ہے۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے سفر نامے پند ونصائح اور سبق آموز نقوش کی عمدہ مثالیں ہیں۔ جہاں تک ان کے اسلوب کا سوال ہے تو اس میں لطافت، شائستگی اور تنوع کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔

رام لعل کا سفر نامہ ''زرد پتوں کی بہار'' (۱۹۷۹ء) ہے۔ اس سفر نامہ میں تقسیم ہند سے لے کر اس کے بعد کے تیس سال کے پاکستان کے حالات کو قلم بند کیا گیا ہے۔ ان کو وہاں کے دیہاتی ماحول کے ساتھ ساتھ وہاں کے لوک گیت اور لوک کتھائیں جو کہ وہاں کی ایک خاص پہچان تھیں بہت پسند آئیں۔ اس کے علاوہ ادبی بحث ومباحث اور ادیبوں سے ملاقاتیں میں سلیم اختر، مشرف انصاری اور ابن انشا خاص ہیں، جنہوں نے تمام حالات وکیفیات کو اپنے سفر نامہ میں پیش کر دیا۔ چونکہ رام لعل افسانے وناول کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں مگر پھر بھی سفر نامہ میں انہوں نے توانائی دکھائی ہے۔ انہوں نے اس سفر نامہ میں وہاں کی سیاسی، سماجی اور

اقتصادی حالات کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔انہوں نے سفرنامہ کوایک نئی جہت اورایک نیارخ عطا کیا جس سے تارکین وطن کی حقیقی امیج سامنے آجاتی ہے۔انہوں نے زرد پتوں کی بہار کے علاوہ ''خواب خواب سفر'' بھی تصنیف کی۔

انتظار حسین نے سفرنامے کی دنیا میں قدم رکھا اور ''زمین اور فلک'' لکھ کر شہرت حاصل کی۔اس سفرنامے میں انہوں نے تقسیم ہند اور اس کے بعد کے حالات کو پیش نظر رکھا ہے۔انہوں نے کئی مرتبہ ہندوستان کا سفر کیا اور اپنے سفرنامے میں ہندوستان کی تہذیبی اور ادبی زندگی کو پیش کیا۔اس سفرنامہ کی واضح خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انتظار حسین کی یادوں اوران کی ذات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔اس سفرنامہ کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انتظار حسین اس ہندوستان کو تلاش کرتے ہیں جوان سے ۱۹۴۷ء میں چھن گیا تھا۔ وہ ایک ایک قدم ماضی کی اس دھرتی پر رکھتے ہیں جوان کی یادوں میں محفوظ ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس سفرنامے میں ایک اداسی کی کیفیت ملتی ہے جو اپنے اندر ماضی کی یادداشت لئے ہوئے ہے۔انتظار حسین کے سفرنامے کی سب سے خاص بات ان کا اسلوب ہے جو دوسرں کے سفرناموں سے مختلف ہے۔

عہد جدید کے سفرناموں میں شریف فاروقی کا ''اتاترک کے وطن میں'' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔اس سفرنامے میں ترکی زیارت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔مصنف نے وہاں کی تہذیب وتمدن، آرائش وزیبائش کی تمام تر جزئیات کو پیش کیا ہے۔سیاح چونکہ خود مسلم شخص تھا اس لئے اس نے اس سفرنامے میں ترکی کو ایک مسلم کی نگاہ سے دیکھا اور اس سے بے حد متاثر ہوا۔شریف فاروقی کے علاوہ ابراہیم جلیس کا سفرنامہ ''نئی دیوار چین'' بھی کافی اہم ہے۔انہوں نے اس سفرنامے میں چین کو اشتراکی پہلو سے دیکھا ہے۔ یہ سفرنامہ معیار پر پوری طرح کھرا اترتا ہے۔اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جنس پر تبصرہ ہے۔انہوں نے اس دور کے چین میں جو جنسی کج روی تھی اس پر روشنی ڈالی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی وجہ سے سماج میں پھیلی برائیوں کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری کے دل پر گہرا اثر پڑتا ہے۔

دور جدید میں مزاحیہ سفرنامہ نگاری نے خوب ترقی کی۔مزاحیہ سفرنامہ نگاروں میں ایک معتبر نام ابن

انشا کا ہے۔ انہوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ اردو نثر کو بھی جلا بخشی ان کے سبھی سفرناموں کی خصوصیت کم وبیش ایک ہی ہے۔ انہوں نے اپنے سفرناموں کو اخباری کالموں کی صورت میں لکھا اور خود اپنے کالموں کو سفری کالم قرار دیا۔ ان کے سفرناموں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے صحافیانہ تحریروں کو صحافت کے زمرے سے نکال کر شگفتہ ادب کے دائرے میں لا کھڑا کیا۔

غالبؔ سے لے کر ابن انشا تک طنز ومزاح کی تاریخ کا جائزہ لینے پر تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے کسی نہ کسی طرح سے اپنی ذات کے حوالے سے مزاح کا تاثر پیدا کیا ہے۔ مزاح کا یہی تاثر ابن انشا کے سفرناموں کی جان ہے۔ لیکن انہوں نے مزاحیہ سفرناموں کے علاوہ سنجیدہ تحریریں بھی لکھی ہیں۔ اگر چہ یہ سنجیدہ تحریریں ان کی نمائندگی نہیں کرتیں لیکن ان کا ذکر بھی ضروری ہے۔

ابن انشا نے اپنے سفرناموں کی طرز تحریر میں وہ چمک دمک اور تر وتازگی پیدا کر دی ہے جو انہی کا حصہ ہے۔ انہوں نے اپنی دنیا بھر کی سیاحت کے دوران دنیا کی تمام شئے کا آنکھوں دیکھا حال اپنے سفرنامے میں بیان کیا ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ ان کے لئے کوئی موضوع شجر ممنوعہ نہیں۔ انتخابات، حکومتیں، لیڈران، ہڑتالیں، فرسودہ نظام تعلیم تقریبات ہر موضوعات کو انہوں نے گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ گویا کہ ان کے سفرناموں میں زندگی کا ہر گوشہ اور ہر شعبہ ان کے طنز وظرافت کا محور ہے۔ ان کے سفرنامے ''دنیا گول ہے'' آوارہ گرد کی ڈائری، نگری نگری پھرا مسافر، ابن بطوطہ کے تعاقب میں، اور ''چلتے ہو تو چین کو چلئے'' کافی مشہور ہیں۔

ابن انشا اپنے شگفتہ، شائستہ اور توانا اسلوب بیان کے باعث آج بھی اسی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ انہوں نے جگہ جگہ محاورے اور چٹکلے کے استعمال سے اپنے سفرنامے کو پر اثر بنا دیا۔ وہ بات میں بات سے اس طرح مزاح پیدا کر دیتے ہیں کہ قاری ان کے حصار سے باہر نہیں نکل پاتا۔

کرنل محمد خان مزاحیہ سفرنامہ نگار ہیں۔ ابن انشا کے ہم عصروں میں کرنل محمد خان اور جمیل الدین عالی کے نام بہت اہم ہیں کیونکہ ان کی نثر میں کم وبیش وہی ساری خوبیاں نظر آتی ہیں جو ابن انشا کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ کرنل محمد خاں کا نام سفرنامہ کے بغیر ادھورا ہے انہوں نے کئی سفرنامے لکھے ہیں ''بزم آرائیاں'' ''بجنگ آمد''

اور ''بسلامت روی'' ان کا مشہور سفر نامہ ہے۔ ''بسلامت روی'' شگفتہ انداز بیان کی ایک دل آویز مثال ہے۔ ان کے سفر نامے میں زندگی مسکراتی ہوئی نظر آتی ہے ساتھ ہی ساتھ معاشرے کی حقیقت نگاری کا ذکر بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ کردار اور ماحول دونوں کو مزاحیہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ وہ کرداروں میں کھو جاتے ہیں جو ان کے اردگرد چلتے پھرتے دوڑتے اور زندگی کی تگ ودو میں مصروف عمل نظر آتے ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ محض سفر نامہ ہی نہیں لکھتے بلکہ سفر پر اپنی تنقیدی نظر بھی ڈالتے ہیں۔ وہ مشرقی افلاس وغربت کے ساتھ مشرق کی غیرت کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ وہ اس بات کا اظہار اتنی خوبصورتی سے کرتے ہیں کہ مشرقی خطہ فردوس بریں نظر آنے لگتا ہے یہی وجہ ہے کہ قاری ان کی تحریروں کے بہاؤ میں بہتا چلا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ رعایت لفظی کا استعمال بھی انہوں نے خوب کیا ہے۔

جمیل الدین عالی کا سفر نامہ ''دنیا میرے آگے'' ۱۹۷۵ء میں منظر عام پر آیا۔ ان کے سفر ناموں کو ترتیب ابن انشا نے ہی دیا اور دیباچہ بھی لکھا۔ ان کے سفر نامے میں غزل کا انداز بیاں پایا جاتا ہے وہ اپنے سفر نامے کے ذریعے پوری دنیا کی سیر کراتے ہیں۔ ان کے سامنے زندگی بازیچۂ اطفال کی طرح نظر آتی ہے اور قاری کو ملک کی تاریخی، جغرافیائی، سماجی، تہذیبی اور سیاسی معلومات میں اضافہ کرتی ہے اور دلچسپی بھی کم نہیں ہونے دیتی۔ ان کا اسلوب ڈھیلا ڈھلا وررواں دواں اور زبان سہل ممتنع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سفر نامے کے بعض تلخ واقعات پڑھنے والے کو دلبستگی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ ''دنیا میرے آگے'' کے علاوہ ''تماشا میرے آگے'' بھی ان کا ایک مشہور سفر نامہ ہے۔ یہ دونوں سفر نامے یورپ اور ایشیا کے مختلف مقامات کی سیر کراتے ہیں۔

اس کے علاوہ دور جدید کے سفر ناموں میں ثریا حسین کا پیرس وپارس، عبادت بریلوی کا ترکی میں دوسال، مختار الدین احمد کا زُ ہے روانی عمرے کہ در سفر گذرد، حکیم محمد سعید کا یورپ نامہ، جرمنی نامہ، ماہ وروز اور شب وروز، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا سفر آشنا، مرزا ادیب کا ہمالہ کے اس پار، محمد طفیل کا مسافرانہ، وزیر آغا کا بیس دن انگلستان میں، مسعود احمد برکاتی کا دو مسافر دو ملک، محمود نظامی کا 'نظر نامہ' اختر ریاض الدین

''دھنک پر قدم'' مستنصر حسین تارڑ کے ''نکلے تری تلاش میں'' ''اندلس میں اجنبی''، ''خانہ بدوش''، اور ''ہنزۂ داستان'' نے اردو سفر نامہ نگاری کی تاریخ میں گراں قدر اضافہ کیا جس کی وجہ سے اردو سفر نامہ دوسری اصناف ادب کے مدمقابل رکھا جاسکتا ہے۔

مختصر یہ کہ اردو سفر نامے کی روایت کی ابتداء غالباً انیسویں صدی کے نصف اول کے آخری عشرے میں ہوجاتی ہے مگر اس کا عہد زریں ہم دور جدید کو ہی کہیں گے، کیونکہ اس دور میں قدیم سفر نامے کی روایت کو مستحکم بنانے کے عمل کے ساتھ ساتھ اس میں جدت طرازی اور تنوعات کو بھی شامل کرنے کا عمل ملتا ہے۔ یہی وہ دور ہے جب سفر نامہ حادثات وواقعات اور جغرافیائی کوائف کا بیان محض نہیں رہ جاتا بلکہ اس میں جذبات و احساسات اور تأثرات وتصورات کے قمقمے بھی روشن ہونے لگتے ہیں اور اس کے آفاق وابعاد میں وسعت کے ساتھ ساتھ ہمہ گیری بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ اب سفر نامہ ایک ایسا مرقع بن کر ہمارے سامنے آتا ہے جس میں کسی کو بھی تنگ دامانی کا شکوہ نہیں رہتا۔ ایک اہم ترین بات جو اس دور کے سفر ناموں میں ملتی ہے وہ اس کی تکنیک سے متعلق ہے۔ اس دور میں خطوط، خودنوشت، رپورتاژ، افسانہ، ناول، انشائیہ جیسی اصناف ادب سے ان کے اسالیب مستعار لئے جاتے ہیں اور اس میں کچھ اس طرح کی فنی مہارت کا مظاہرہ کیا جاتا ہے کہ وہ سفر نامے کے اپنے اسلوب بن جاتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس دور میں جہاں اس کے موضوعی اُفق پھیلتے ہیں، وہیں اسلوب کی سطح پر بھی اس میں کافی وسعت آتی ہے اور اس طرح یہ صنف اپنے معراج کمال تک پہنچ جاتی ہے۔ اردو سفر نامے کی روایت ہنوز زندہ ہے۔ اور اب تو سفر نامے اور زیادہ کثرت کے ساتھ لکھے جارہے ہیں جس کی بنا پر یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا مستقبل روشن اور تابناک ہے۔

باب دوم

ابن انشا کے سفرناموں کا

سیاسی اور سماجی پس منظر

ابن انشا کے سفرناموں کا سیاسی اور سماجی پس منظر

اردو ادب میں ابن انشا کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کا تعارف کرانا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، ان کی شخصیت کئی اعتبار سے قابل توجہ ہے۔ وہ بیک وقت ایک پختہ فکر اور باکمال شاعر بھی ہیں اس کے علاوہ انہوں نے فکاہی مضامین بھی لکھے ہیں، طنز و مزاح نگاری کو بھی تختہ مشق بنایا ہے، بچوں کا ادب بھی تخلیق کیا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ ایسے سفرنامے بھی ضبط تحریر میں لائے ہیں جن سے ان کی جہاں دیدنی اور تجربہ کاری کا جلوہ منعکس ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ان کی شخصیت کثیر الجہات اور بوقلموں شخصیت ہے لیکن میں نے ان کی شخصیت کے جن پہلوؤں کو اپنے ''ایم۔فل'' کے اس مقالے کے لئے منتخب کیا ہے وہ ان کی سفرنامہ نویسی ہے۔ سردست میں ان کے سفرناموں کے سماجی اور سیاسی پس منظر پر روشنی ڈالنے کی جرأت کررہا ہوں۔

ابن انشا کے سفرناموں میں جس سماجی اور سیاسی پس منظر کی جھلک ملتی ہے وہ دوسرے سفرنامہ نویسوں کے یہاں شاذ و نادر ہی ملے گی۔ ابن انشا ایک ایسے بنجارے کی شکل میں سامنے آتے ہیں جو بادی النظر میں اپنے گردوپیش پر سرسری نگاہ ڈالنے والا دکھائی دیتا ہے لیکن درحقیقت اس کی آنکھ اشیا کے باطن کو ٹٹولتی ہے اور ہمیں ان کے ماضی اور حال کے سیاسی اور سماجی پس منظر کی طرف کھینچ لے جاتی ہے۔ وہ اپنے سفرناموں میں سیاسی اور سماجی زندگی کو اپنے ساتھ اس طرح چمٹائے ہوئے نظر آتے ہیں کہ حقیقت خود بخود آشکار ہونے لگتی ہے۔ ابن انشا کے سفرناموں میں طنز لطیف کچھ اس طرح شامل ہے کہ گہرائی اور اثر آفرینی پیدا ہوجاتی ہے اور ہدف طنز چونکہ ان کا اپنا معاشرہ ہے اس لئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ دل میں

ایک سوئی سی چبھ جاتی ہے۔ انشا دوسرے ملکوں کے معاشروں میں خیر و نیکی کی قدروں کی جستجو زیادہ کرتے ہیں اور ترقی یافتہ تہذیب و تمدن کا موازنہ اس تہذیب و تمدن سے کرتے ہیں جو ابھی ابتدائی مرحلہ میں ہے یا جو ابھی پوری طرح برگ و بار نہیں لا پائی ہے۔ جس سے ان کے سفر ناموں میں زندگی کی طرف خوش رغبتی کے ساتھ پیش قدمی کرنے کا رجحان نمایاں ہے اور معاشرتی حقیقت کی صورت مسخ کئے بغیر وہ کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ حقیقت خود بخود نمایاں ہو جاتی ہے۔ ابن انشا کے مزاج میں جو بذلہ سنجی ہے اس نے بھی سیاسی اور سماجی ماحول کو ان کے مجلسی مزاح میں شامل ہونے کی دعوت دی ہے اور یوں ہمارا سیاسی اور سماجی شعور ایک مسکراتے ہوئے تناظر کی خوش نما کیفیت میں ظاہر ہونے لگتا ہے۔

بہر حال جہاں تک ابن انشا کے سفر ناموں میں سیاسی اور سماجی پس منظر کا سوال ہے تو اس کی باز یافت کے لئے ہمیں ابن انشا کے ادبی زمانے یا اس زمانے کی تاریخ پر نظر ڈالنی ہوگی۔ جب ہم ابن انشا کے عہد پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمارے سامنے دو طرح کا ہندوستان جلوہ فرما ہوتا ہے ایک تقسیم سے پہلے کا اور دوسرا تقسیم کے بعد کا۔ یوں تو تقسیم ہند سے پہلے ہی شمالی ہند میں وسیع پیمانے پر ہجرت ملک کے طول و عرض میں جب فسادات شروع ہوئے تو سب سے زیادہ خونریزی اور بربریت ہندو مسلم مہاجرین کے قافلوں نے دیکھی۔ اس ہجرت کے سفر نے دونوں ملکوں میں ایک ایسی بازآبادکاری کی فضا پیدا کی کہ لاکھوں انسان اپنی زمین سے اجڑنے کے بعد نئی زمین میں آباد ہوئے لیکن اپنے ذہن سے لوگ اپنے وطن، اپنے گھر اور اپنے گاؤں کی یاد کو بھلا نہ سکے جس کے نتیجے میں مہاجرین اکثر و بیشتر نوستالجیا کا شکار ہوتے رہے۔ اس ضمن میں ریاض احمد ریاض فرماتے ہیں:

> ''۱۹۴۷ء کی پہلی ششماہی تھی جب پورا ملک بالخصوص
> پنجاب ہندو مسلم فسادات کی مکمل لپیٹ میں آچکا تھا۔ ہر
> طرف بہیمیت بربریت اور کشت و خون کی حکمرانی تھی۔
> سامراجی شیطنیت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے فسادات

کے عفریت نے پنجاب اور دلی کی سرزمینوں کو لہولہان کردیا تھا لیکن موت اور بربادی کے انہی گھٹا ٹوپ اندھیروں سے آزادی ہند اور تحریک پاکستان کا آفتاب تازہ بھی طلوع ہورہا تھا۔ یہ تو تھی ہندوستان کی حالت۔ عالمی منظر یہ تھا کہ اگرچہ جنگ عظیم ختم ہوئے ڈیڑھ پونے دوسال (جون ۱۹۴۵ء) ہو چکے تھے لیکن دنیا اب اس کے اختتام پر اس کے اثرات سے پیدا ہونے والے مسائل سے دوچار تھی۔ ہولناک تباہی نے محکوم اقوام کی معیشت کو پامال کر کے انہیں نئے مصائب میں مبتلا کردیا تھا۔ ترقی یافتہ ممالک جن کی تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کر چکی تھی اب نئی زندگی پانے کے لئے محکوم ملکوں کا رہا سہا خون بھی چوس لینے کی فکر میں تھے۔ لیکن یہی وہ زمانہ تھا جب ایشیائی عوام میں بیداری کی لہر جوبن پر تھی۔ گراں خواب چینیوں کی عوامی فوج چین آزادی کے جھنڈے گاڑنے کی پوری قوت کے ساتھ آقاؤں کے مقابل آچکی تھی اس طرح یہ دور تاریخ عالم کا ایک عجیب و غریب پیچیدہ دور تھا.....انہیں دنوں ہمارے ابن انشا ہارڈنگ سرائے کے ایک کمرے میں رہائش پذیر اپنے بدلتے مستقبل کی جھلک دیکھ رہے تھے۔"(۱)

---

(۱) ریاض احمد ریاض.....ابن انشا احوال و آثار ۱۹۸۸.....ص ۱۰۷۔۱۰۶

ابن انشا ایک حساس قسم کے انسان تھے۔ وہ اپنی نجی زندگی میں جس طرح کے مصائب وآلام سے دوچار ہوئے بہت کم لوگ ہوتے ہیں مگر یہ ان کی تحریروں میں کم نظر آتا ہے۔ ابن انشا نے اپنی زندگی کے مسائل کو اپنی اعلیٰ تعلیم میں حائل نہیں ہونے دیا، انہیں بھی ہجرت کر کے پاکستان جانا پڑا لیکن اپنے ہجرت کے عمل کو ابن انشا نے کوئی کارنامہ یا قربانی کا نام نہیں دیا اور نہ ہی ابن انشا نقل مکانی سے کسی طرح کا تقدس وابستہ کرتے تھے۔ انشا کے تجربات ومشاہدات پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ ایک محنت کش انسان نظر آتے ہیں اور جب ہم سیر وسیاحت یا ان کے سفرناموں کا تجزیہ کرتے ہیں تو ان کا مقام بلاشبہ بہت بلند نظر آتا ہے۔

ابن انشا کے سفرناموں کے مطالعہ کے بعد جب ہم ہندو پاک کے ساتھ پیرس کے سماجی اور سیاسی حالات کا موازنہ کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہاں کے سماج اور ہندو پاک کے سماج میں بہت فرق ہے یہ فرق اس طرح ہے کہ ہمارے یہاں درس گاہوں میں ایسا ماحول ہوتا ہے کہ شاگرد اپنے استاد سے بہت ڈرتا ہے کوئی بات کہنی ہو تو لب ہلتے ہی استاد کی ڈانٹ پڑ جاتی ہے جب کہ فرانس میں استاد اور شاگرد کا رشتہ دوستانہ ہے۔ یہاں پر ہر رنگ کے طلباء ملتے ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ میں کالے اور گورے کی یہ لڑائی تھی وہ فرانس میں نہیں۔ ظاہر ہے جہاں کا سماج اچھا ہوگا وہاں کا سیاسی ماحول بھی اچھا ہوگا۔ جس عہد میں ابن انشا نے فرانس کا سفر کیا اس عہد میں فرانس میں تحریک طلبہ اپنے عروج پر تھی۔ اگر ہم تحریک طلبا کی تاریخ پر غور کریں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ فرانس کے طلبا کے ذریعے کیا گیا احتجاج اب تک کی تاریخ میں طلبا کے حق میں کیا گیا سب سے کامیاب یا سب سے منظّم احتجاج ہے۔ اس کی کامیابی میں طلبا کے ساتھ سب سے اہم رول اساتذہ نے ادا کیا۔ مثال کے طور پر جو فرانسیسی ادب کا بہت ہی معتبر اور مشہور نام ہے جب یہ اپنے طلبا کو درس دیتا تھا تو اس کے اساتذہ لین پول سارٹر اور التھسیر بھی اس کو سنتے تھے اور سننے کے ساتھ ساتھ اس پر عمل بھی کرتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کا ماننا تھا کہ انسان پیدا ہونے کے بعد سے مرنے کے وقت تک سیکھتا ہے۔ اس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ فرانس میں اساتذہ اور طلبا کے بیچ دوستانہ رشتہ تھا۔ فرانس کے اس عہد کا موازنہ اگر ہم ہندو پاک تناظر میں کرتے ہیں تو یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ

فرانس کی طرح ہندو پاک میں استاد اور شاگرد کے بیچ کا رشتہ دوستانہ نہیں ہے۔

اس کی عکاسی ہمیں آوارہ گرد کی ڈائری میں نظر آتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''کہہ نہیں سکتے کہ پیرس کی کس بات پر ہمارا دل آیا۔ خوباں تو یہاں کے جیسے بھی ہوں۔ لیکن ہمیں سین کے ساحلوں کی آوارا گردی۔ پرانی کتابوں، نقشوں اور تصویروں کی سیر دریا، دکانوں کے ذخیرے اور شاہراہ سال مثال .MICHAELST کا ماحول خاص طور پر بھائے۔ درس گاہوں کا ماحول ہم آپ جانتے ہیں کہ کیسا ہوتا ہے۔ جورِ استاد، سخت گیر اور ڈن۔ آپ منچلے ہیں تو اونچی دیواریں پھاندیئے کمندیں پھینکئے ورنہ .....لیکن سوربون کے طالب علموں کو فرانس کی روایات آزادی سے حصہ وافر ملا ہے۔ ان طالب علموں میں گورے بھی ہیں..... کالے بھی دیوار رنگ جو برطانیہ میں کم کم اور امریکہ میں بہت اونچی ہے۔ فرانس میں وجود نہیں رکھتی۔ کالوں کو دیکھا کہ شکلیں تو ہم ایسی لیکن نصیبے سکندری، ہر زاغ کو چونچ میں ایک ایک دو دو انگور جوانی کی راتیں مرادوں کے دن۔ اے میاں کیوں اتنی دیر کر کے آئے۔ اب ہمیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر۔ یہاں کے لوگ بھی طالب علموں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ اگر کسی ڈرامے یا شو کا ٹکٹ دس یا بیس فرانگ ہے

تو طالب علم کا ایک فرانگ بھی بہت جانا جاتا ہے۔ یہ
بچارے بھی قلندرانہ زندگی کے عادی ہیں۔کوچہ سال مثال
کے دورویہ سستے کیفوں کی قطاریں ہیں۔طالب علموں کے
غول باہر لگے ہوئے مینو پڑھ کر کم خرچ کھانوں کا انتخاب
کرتے ہیں، بلکہ زیادہ تر تو چمچے اور پلیٹ کے جھنجھٹ میں
نہیں پڑتے۔ ہاتھ میں سینڈوچ ہے۔ جب ذرا گردن
جھکائی کھالیا۔ اس آزادی اور شانِ قلندری کی توقع لند،
آکسفورڈ یا کیمبرج کے طالب علم سے نہ رکھئے۔''(۱)

اس اقتباس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ برصغیر کے سماجی اور سیاسی نظام سے فرانس کا اگر موازنہ کریں تو وہاں کے نظام میں جو خوبی ابن انشا تلاش کرتے ہیں وہ ہمارے سماج میں اس وقت شاذ و نادر ہی ملے گی یا یوں کہیں کہ یہ خوبی اس عہد میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ جہاں تک رنگ و نسل کا سوال ہے تو سفرنامہ 'آوارہ گرد کی ڈائری'' پڑھنے کے بعد اندازہ ہوجاتا ہے کہ فرانس میں یہ امتیاز بالکل نہیں ہے۔ جبکہ امریکہ اور لندن میں مساوات لوگوں کے اندر بے پناہ عدم پائی جاتی ہے۔ برصغیر کا اگر ہم دنیا کی مساوات سے موازنہ کریں تو ہندوستان بھی کم نہیں یہاں تو زمانۂ قدیم سے ہی مساوات کی جنگ چل رہی ہے جو آج بھی نظر آتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے یہاں کالے گورے کی جگہ ذات پات کا مسئلہ ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ کہ فرانس کے باشندے اچھی سوچ و سمجھ رکھنے والے ہیں جس سے وہاں کا سیاسی اور سماجی نظام نسلی تفریق سے پاک وصاف ہے۔ ابن انشا نے کالے گورے کی مساوات کا خاکہ اپنے سفرنامے میں کھینچ کر ہمارے علم میں اضافہ کیا ہے۔ ابن انشا فرماتے ہیں کہ فرانس کے طلبہ آزادانہ اور قلندرانہ زندگی گزارتے ہیں وہاں کے سماج میں انہیں عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ وہاں کے سماج کا سیاسی

---

(۱) ابن انشا.....آوارہ گرد کی ڈائری ۲۰۰۱.....ص ۳۱۔۳۰۔۲۹

نظام ایسا تھا کہ طلبا کو وہاں کے عام لوگوں سے زیادہ اہمیت دی جاتی تھی اور ہر معاملہ میں انہیں دوسرے لوگوں پر فوقیت حاصل تھی اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ طالب علم جو ہوتا ہے اس کے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہاں کے سیاسی نظام نے طلبا کو ہر چیز میں چھوٹ دی تا کہ حصول علم کے دوران انہیں کسی چیز کی پریشانی نہ ہو۔ جبکہ اس عہد میں ہمارے یہاں طلبا اپنی بات اساتذہ کے سامنے رکھنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے تھے جس سے ان کے اندر کے جذبات واحساسات اندر ہی رہ جانے کی وجہ سے وہ ایک طرح کی گھٹن محسوس کرتے تھے اور استاد وشاگرد کے درمیان کسی موضوع پر کھل کر گفتگو نہ ہونے کے سبب مذکورہ موضوع کا معنوی پہلو پوشیدہ ہی رہ جاتا تھا۔ ابن انشا جب فرانس پہنچتے ہیں تو وہاں کے سماج کا سیاسی نظام دیکھ کر بول پڑے۔ اے میاں کیوں اتنی دیر کر کے آئے۔ اب ہمیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر۔

ابن انشا جب فرانس کے برعکس لندن کے سیاسی اور سماجی پس منظر کی تصویر کشی کرتے ہیں تو وہ لندن کو فرانس کے مقابلے بہت بلند تصور کرتے ہیں۔ ابن انشا جب لندن کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی منظر نامے پر روشنی ڈالتے ہیں تو وہاں کے لوگوں کو بہت پروفیشنل (دنیادار) قرار دیتے ہیں۔ یہ انشا کا الزام نہیں بلکہ ان پر جو گزری اس کی روداد ہے۔ ابن انشا کے سفر نامے کو پڑھنے کے بعد یہ بات مکمل طور پر واضح ہوگئی کہ لندن کے لوگ پاکستانیوں کے بارے میں کیا سوچتے ہیں اور ان کا تاثر پاکستانیوں کے بارے میں کیا ہے۔ لندن کے باشندے پیسے کو انسان سے زیادہ اہمیت دیتے اور ضرورت پڑنے پر پیسے کے لیے وہ حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ انشا فرماتے ہیں:۔

> ''میر باقر علی داستان گو نے کسی غریب مسافر کے سرائے میں جانے اور بھٹیارنوں سے پالا پڑنے کا حال اپنی داستانی بولی میں لکھا ہے، اس وقت یاد آ گیا۔ لیکن نہیں یہاں اتنی زدہ کیف بھی نہیں۔ ہاتھی لٹے گا بھی تو کہاں تک۔ یہ سچ ہے کہ وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں۔ یعنی

یہ وہ کمرہ نہیں جس کی بکنگ میں نے کراچی ہی سے خط لکھ کے کرائی تھی بے صبر مسز واٹسن نے وہ کسی اور گاہک کو دے دیا۔ اور دیکھا مجھے تو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ۔ یعنی میرا منھ تکنے لگیں کہ آپ تو سچ مچ آ گئے۔ میں نے کہا اس کی ضرورت نہیں ہم بار خاطر ہوں تو کہیں اور ٹھکانہ کریں، شب باشی کا بہانہ کریں۔ سوچ کر بولیں: اجی نہیں ٹھہریئے کوئی بندوبست کرتی ہوں۔ میری خاطر ان کو اتنی منظور ہوئی کہ اس کمرے سے نوکرانی میری کولات مار کر نکال دیا۔ میں نے کہا..... یہ کیا کیا؟ اس بچاری کو کیوں نکالا مجھے کہیں اور جگہ مل جائے گی۔ بولی: اجی صاحب آپ پروانہ کیجئے..... رقیق القلب نہ بنیئے۔ آپ میرے لئے زیادہ اہم ہیں۔ بزنس از بزنس، اس کا کیا ہے، چند دن میں دھکے کھا کر پھر آ جائے گی۔ کئی بار جا چکی ہے اور آ چکی ہے۔ ہاں تو لایئے ایک ہفتہ کا کرایہ پیشگی۔ آٹھ پونڈ''۔ آپ نے لندن میں ایشیائیوں سے نسلی امتیاز برتے جانے کی داستانیں سنی ہوں گی اور خبریں دیکھی ہوں گی، لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ مسز واٹسن نے میری خاطر اپنی ایک ہم وطن کو چلتا کیا..... ہاں آٹھ پونڈ کی بات البتہ ہے۔ رنگ و نسل اپنی جگہ پیسہ اپنی جگہ۔(۱)

---

(۱) ابن انشا..... آوارہ گرد کی ڈائری ۲۰۰۱..... ص ۳۷۔۳۸

یہ تو ابن انشا کے بات کرنے کا شگفتہ اسلوب ہے ورنہ سیاحت نگاری کی حد تک بات صرف اتنی ہی ہے کہ سیاحت نامہ بنیادی طور پر ایک سیاح کے ذوق سفر کی باز آفرینی کے مماثل ہے جس سے اس کی اپنی تخلیق آسودگی بھی وابستہ ہوتی ہے۔ سفر نامہ محض ایک سیاح کے سفر کے تاثرات، مشاہدات اور کچھ دیگر حالات و کیفیات کی روداد نہیں ہے بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس سے ہمیں دوسرے ممالک اور اجنبی سرزمینوں کے بارے میں ہر طرح کی سیاسی، سماجی، تاریخی، جغرافیائی یا دیگر معاشرتی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ سفر نامہ نگار کا اہم مقصد معلومات فراہم کرنا نہیں ہوتا اور ہم اس سے ایک ٹورسٹ گائڈ ہونے کی توقع نہیں کر سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سفر نامہ نگار کا مقصد تخلیقی فنکار کے مانند افراد، واقعات اور حالات کا جائزہ لے کر جو تاثر پیدا ہوتا ہے اسے اپنی ذات کے حوالے سے صفحۂ قرطاس پر مرتسم کرنا ہے۔ اس نہج سے ابن انشا بھی کامیاب نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اس اصول کو بخوبی نبھایا ہے۔ ابن انشا نے ''آوارا گرد کی ڈائری'' میں اکثر تاثر کی گہرائی پیدا کرنے کی پوری کوشش کی ہے لیکن انشا کی شرارت بھری اور مزاح سے چمکتی ہوئی آنکھیں ہمیں منظر کے مضحک پہلوؤں کی طرف متوجہ کر لیتی ہیں۔ انشا کے سفر ناموں کو پڑھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے کتنے مزاحیہ انداز میں دنیا کے سماجی اور سیاسی نظام پر چوٹ کی ہے۔ انہوں نے دنیا کے تمام ممالک کو طنز و مزاح کے انداز میں پیش کیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے سفر ناموں میں صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں، والی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

ابن انشا نے پاکستان کی تہذیب و تمدن کا مقابلہ لندن کی تہذیب و تمدن سے کرتے ہوئے دونوں کے درمیان پائے جانے والے فرق کو واضح کیا ہے۔ ''آوارہ گرد کی ڈائری'' میں سماج کے ایک سیاسی حکمراں جو پاکستان اسمبلی کے اسپیکر ہیں ان کی اتنی اچھی تصویر کشی کی ہے کہ واقعہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ انشا نے اپنے سفر نامے میں یہ دکھانے کی پوری کوشش کی ہے کہ سیاست داں پاکستانی سماج میں کس طرح من مانے طور پر جائز کو ناجائز اور ناجائز کو جائز ٹھہراتے ہیں اور اس حربے کے ذریعہ وہ اپنے مفاد کو فوقیت دیتے ہیں۔ جب یہ حکمراں لندن جاتے ہیں تو وہ اپنے عہدے اور رتبے کو وہاں کے سماج پر بھی ویسے ہی تھوپنے کی

کوشش کرتے ہیں جیسے وہ اپنے ملک میں کرتے تھے۔ یہ سیاست داں جو ہمارے سماج کے آئینہ دار ہوتے ہیں وہ سماج میں کیسے گندگی پھیلاتے ہیں انشا نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے۔ ایک اچھے سماج کے لیے ایک اچھے حکمراں کا ہونا ضروری ہے۔ ظاہر ہے جس گھر کے مکھیا کا نظام اچھا ہوگا اس گھر کے لوگ اچھے ہوں گے۔ اس ضمن میں ابن انشا رقم طراز ہیں:۔

''ہمارے ہاں ایک بزرگ جو کہ اسمبلی کے اسپیکر تھے۔ ایک روز جنیوا کے ہوٹل کے باہر سیر کر رہے تھے اور پان کی پچکاریاں مار رہے تھے کہ کچھ بچوں نے دیکھ لیا اور پولیس کو رپورٹ کی کہ ایک شخص خون تھوک رہا ہے۔ فوراً کانسٹیبل آئے اور کہا کہ چلو اسپتال۔ یہ بہت بھنائے اور انگریزی میں عذر کرنے لگے کہ میں یہ ہوں۔ وہ ہوں مجھے تم جیل نہیں بھجوا سکتے لیکن جنیوا کا کانسٹیبل انگریزی زبان کیا جانیں؟ اتفاق سے ایک بھلے مانس کا گزر ادھر سے ہوا۔ انہوں نے صورت حال سمجھی، اور سمجھائی اور ان سے کہا کہ پانوں کی ڈبیا نکال کر انہیں دکھایئے۔ بڑی مشکل سے چھٹکارا ہوا۔ لیکن ہوٹل والوں نے ان کے غسل خانوں کو بھی رنگین پایا۔ تو بہت جز بز ہوئے۔ یہاں تک تو انہوں نے برداشت کیا۔ لیکن ایک روز ان بزرگ کو شک ہوا کہ یہ گوشت جو ہوٹل والے دیتے ہیں۔ شاید ذبیحہ نہیں۔ انہوں نے ہوٹل والوں سے کہا۔ مجھے اپنا باورچی خانہ دکھایئے۔ وہ ایسا مصفّا اور مجلّا تھا کہ ہوٹل والے اکثر مہمانوں کو فخریہ

دکھاتے تھے۔ان کو بھی لے گئے۔ سارا دودھ کی طرح
اسپید۔انہوں نے کہا کوئی مرغی لاؤ۔ وہ سمجھے یہ سوئزر لینڈ
کی مرغیاں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک پلی ہوئی مرغی لاکر
انہوں نے دی۔ پاس ہی چاقو پڑا تھا۔انہوں نے اللہ اکبر
کہہ کراس کی گردن پر پھیر دیا۔وہ پھڑ پھڑا کران کے ہاتھ
سے نکل گئی لیکن ادھ کٹی گردن کے خون کے چھینٹوں سے
سبھی کے کپڑے گلنار ہوگئے سارا باورچی خانہ بھی رنگین
ہوگیا۔یورپ میں خود مرغی یا کوئی اور جانور ذبح کرنا جرم
ہے۔ وہاں بھی یہ اپنی حیثیت کا حوالہ دے کر چھوٹے لیکن
بعد میں اس ہوٹل والے پاکستانی کو دیکھ کر انکار کر دیتے
تھے کہ ہمارے یہاں کمرہ نہیں ہے۔''(۱)

ابن انشا کو سیر وسیاحت کے شوق نے نگری نگری پھرنے پر مجبور کیا لیکن ان کو اس بات کا ہمیشہ افسوس رہا کہ جب وہ بیرون ملک کے سفر پر ہوتے ہیں تو ان کی غیر موجودگی میں ملک میں کوئی نہ کوئی خرابی پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ابن انشا کے عہد کی تاریخ پر جب نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ان تمام مصائب وآلام کو بھلا کر عوام نے اپنے ملک کو ترقی کے راستے پر لانے کی ہر ممکن کوشش کی۔لیکن سیاست دانوں کی لاپرواہی نے اس ملک کو اور بھی تشویشناک راہ پر گامزن کر دیا۔ یہ سیاست داں عوام کی بھلائی کے بجائے اپنی جھولیاں بھرنے میں مصروف رہے جس کی وجہ سے پاکستان کی سیاسی اور سماجی فضا بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔نتیجتاً عوام نے احتجاج کرنا شروع کیا۔اس احتجاج میں طلبہ سے لے کر بڑی عمر کے لوگوں نے حصہ لیا۔ جب عوام نے سڑکوں پر اترنا شروع کیا تو سیاست دانوں کو یہ یقین نہیں آیا کہ جس

---

(۱) ابن انشا.....آوارہ گرد کی ڈائری ۲۰۰۱.....ص ۵۴۔۵۳

عوام کو بیوقوف بنا کر وہ اپنی جھولیاں بھرنے میں لگے ہوئے تھے ایک دن سڑکوں پر اتر کر ان کے خلاف نعرے بھی لگائیں گے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان اپنے وجود کی تلاش میں ترقی کے راستے پر گامزن ہونے کی پرزور کوشش میں تھا لیکن یہاں کے سیاست دانوں کو یہ پسند نہ تھا کہ ان کی ترقی کے بجائے ملک کی ترقی ہو۔ اس کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس عہد کے پاکستان کا سیاسی اور سماجی نظام ہی ایسا تھا کہ ہر انسان اپنے مفاد کیلئے ایک دوسرے کا پیر کھینچنے میں مصروف تھا۔ اس کو اس بات کی پرواہ ہی نہیں تھی کہ ملک ابھی وجود میں آیا ہے اور ہر فرد کو ملک کے حق میں کام کرنا چاہئے۔ ان تمام باتوں کو دھیان میں رکھ کر ابن انشا نے اس عہد کے پاکستان کی جو تصویر کشی کی ہے اس سے ان کے عہد کے پاکستان کا پورا نقشہ ابھر کر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ابن انشا طنز و مزاح کے ذریعہ اپنے ملک کی جو تصویر پیش کرتے ہیں اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ابن انشا کتنے اچھے مرقع نگار ہیں۔ ابن انشا کی جو سب سے بڑی خاصیت ہے وہ یہ کہ ایک بنجارے کی شکل میں سامنے آتے ہیں اور وہ اپنے گرد و پیش پر بیگانہ روی کے ساتھ نظر ڈالتے ہیں جس سے حقیقت شناس نظریں اشیا کے باطن کی تلاش و جستجو میں مصروف ہو جاتی ہیں اور ہمیں ان کے ماضی اور حال سے متعارف کراتی چلی جاتی ہیں۔ ابن انشا کی شخصیت میں سرشار کی سیلانی اور میر امّن کی درویشی دونوں کی خصوصیات ملتی ہیں۔ ابن انشا پاکستان کے وزیر صحت پر روشنی ڈالتے ہوئے مزاحیہ انداز میں معاشرتی ناہمواریوں کی تشویشناک تصویر کتنے خوب صورت انداز میں پیش کرتے ہیں:۔

> ''ہم جب کبھی ملک سے باہر قدم نکالتے ہیں، پیچھے کوئی نہ کوئی خرابی ہو جاتی ہے۔ لوگ ہماری غیر حاضری کا فائدہ اٹھانا شروع کر دیتے ہیں۔ ۱۹۶۸ء کے اواخر میں یہ سوچ کر کہ اب یہ ملک نوزائیدہ نہیں رہا، ماشاءاللہ بالغ اور ہوشمند ہو گیا ہے۔ ہم ایک دورے پر نکل گئے۔ سنگاپور بھی نہ پہنچے تھے کہ لڑکوں کے ہڑتالیں کرنے کی اطلاعیں آنے لگیں۔ ہم نے سوچا کوئی بات نہیں، ناسمجھ ہیں، ہم واپس جا کر سمجھا دیں گے۔ لیکن ہانگ کانگ پہنچنے پر

معلوم ہوا کہ بڑی عمر کے لوگ بھی بیانات دینے لگے ہیں۔جلوس نکل رہے ہیں۔لاٹھی چارج ہورہا ہے وغیرہ۔ یہ سچ ہے کہ ہم وہاں سے لوٹ آتے تو صورت حال کی اصلاح کرسکتے تھے ..... خیر ہماری بات چھوڑیئے، تشویشناک خبریں سنتے تھے تو ہر بےعمل محبّ وطن کی طرح ملک کے حق میں دعا کرکے اپنے فرض سے سرخرو ہوجاتے تھے۔لیکن ہمارے ہمسفر فضل الباری صاحب کا معاملہ دیگر تھا۔آپ مشرقی پاکستان کے وزیر صحت تھے۔ اور ہمارے تین نفری وفد کے لیڈر۔صحت ان کی خاصی خراب ہمارے ہمرکاب جو تین ایرانی اور تین ترک تھے۔ وہ فقرہ بھی کس دیتے تھے کہ وزیر صحت کسی اچھی صحت والے کو بنایا ہوتا۔ بلکہ بہتر تو یہی تھا نہ بنایا ہوتا۔خبریں سن سن کر ان کا ہاضمہ خراب ہوگیا اور منھ ذرا سا نکل آیا۔شکاگو میں انہوں نے ہم سے کہا کہ ملک کی حالت خراب ہورہی ہے۔میری وزارت خطرے میں ہے۔جب اوپر والا ہی نہ رہے گا تو ہم نیچے والے کیسے رہیں گے۔ مجھے تو بار بار غسل خانے جانا پڑتا ہے۔اب تم میری جگہ کام کرو ہم نے مؤدبانہ کہا کہ ہم مشرقی پاکستان کے وزیر صحت نہیں ہوسکتے، ہمیں اس قسم کے کام کا تجربہ نہیں۔آپ حوصلہ نہ چھوڑیں۔ بولے میں تم سے مشرقی پاکستان کے وزیر صحت ہونے کی فرمائش نہیں کررہا۔اس وفد کی بات کررہا ہوں جو کچھ کرنا ہے تم ہی کیا کرو۔ میں اب سویڈن اور ترکی وغیرہ بھی نہیں جاتا۔ واشنگٹن ہی سے رخت سفر باندھتا ہوں۔ نیویارک ہم ان کو زبردستی لے تو گئے لیکن وہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلے اور وہاں سے لندن کے ایئرپورٹ پر پہنچتے ہی وہ ہم سے یوں جدا ہوئے کہ دعا سلام بھی نہ کی۔ان کی وزارت کے ساتھ شبے ماند، شبے دیگر نمی

ماند کی واردات ہوئی۔ گویا وہ سیاسی بصیرت سے ایسے محروم نہ تھے، جیسے صحت سے تھے۔''(۱)

ابن انشا کے سفر نامہ ''چلتے ہو تو چین کو چلیے'' کے مضمون 'کیا قافلہ جاتا ہے' میں پاکستان کے ادیبوں کے وفد کی سیر و سیاحت کی داستان ہے۔ یہ ادیب ابن انشا کے خاص دوستوں میں شمار ہوتے ہیں، ابن انشا اپنے دوستوں کے ساتھ ۱۹۶۶ء میں چین کے سفر پر جاتے ہیں حالانکہ ابن انشا چاہتے تھے کہ وہ اپنے دوستوں کے بغیر ہی چین کا سفر کریں اس کے لیے ابن انشا نے ہر ممکن کوشش بھی کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے دوستوں سے رشتے خراب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ ابن انشا جب سفر پر جاتے تو ان کے احباب اور دوست فرمائشوں کی لمبی لسٹ دے دیتے تھے۔ ان فرمائشوں میں کچھ کی ہی تعمیل کر پاتے تھے جس کی وجہ سے باقی لوگوں سے ان کے رشتے خراب ہو جاتے تھے۔ ابن انشا نے اس سفر نامے میں اپنے عہد کے سماج کی عکاسی کی ہے۔ اس دور کا سماج ہی ایسا تھا کہ لوگ دوسرے ملکوں سے لائے ہوئے سامان کو اپنے ملک میں بنے سامان پر فوقیت دیتے تھے یہ صرف ابن انشا کے عہد کی بات نہیں ہے بلکہ آج بھی ہمارے یہاں ایسا ہی ہوتا ہے کہ کوئی شخص اگر دوسرے ممالک سے سیر و سیاحت یا تجارت کر کے واپس آتا ہے تو اپنے دوست واحباب کو تحفہ دیتا ہے۔ جس کو لوگ بہت اہمیت صرف اس لیے دیتے ہیں کہ یہ دوسرے ملک میں بنا ہے اور دوسرے ملک میں تیار ہونے کا مطلب لوگ یہ نکال لیتے ہیں کہ غیر ملکی سامان اپنے ملک میں بنے سامان سے بہتر ہوتا ہے حالانکہ یہ سچائی سے پرے ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کی خاص وجہ ہمارے سماج کے اندر تعلیم کی کمی ہے۔ ابن انشا فرماتے ہیں:

''ہم نے بہت کوشش کی کہ ہمارے چین جانے کی کسی کو
کانوں کان خبر نہ ہو، لیکن تدبیر کند بندہ تقدیر زندہ خندہ یہ
بات نہیں کہ ہم چھپ چھپا کر بھیس بدل کر بلا پاسپورٹ

---

(۱) ابن انشا.....ابن بطوطہ کے تعاقب میں.....۲۰۰۱.....ص ۱۵،۱۴،۱۳

چین جارہے تھے، یا مغربی دنیا سے اس امر کو چھپانا مقصود تھا بلکہ محض دوستوں اور ہمسایوں سے تعلقات خوشگوار رکھنے کیلئے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہم جب ایران گئے ہیں تو ہماری جیب میں دوستوں، رشتہ داروں اور ہمسایوں ماں جایوں کی فرمائشوں کی ایک لمبی لسٹ تھی.....ہم ان فرمائشوں میں صرف ۱۰ اور ۸ کی تعمیل کر پائے تھے یعنی فقط چند کنگھیاں چند پراندے اور آٹھ نمبر کی سلائیاں سوئٹر بننے کی لاسکے۔ باقی پندرہ فرمائش کرنے والوں سے ہمارے تعلقات کی پرانی خوشگواری اور خلوص کبھی بحال نہ ہوسکا..... اس راز داری کے باوجود ہمارے ایک دوست نے ہماری ڈائری میں لکھوا ہی دیا کہ بھابھی کے لیے دوسوٹ بروکیڈ کے۔ ایک پریشر ککر، اور ایک سلائی مشین لے کر آنا۔ ایک بزرگ ہمسائے میں تشریف لائے اور کہا کہ آپ کو معلوم ہے میں یہاں کی کوئی چیز استعمال نہیں کرتا۔ میرے گھر میں سب چیزیں ولایت کی ہیں۔ میرے لیے مسالہ پیسنے کی بجلی کی مشین ضرور لانا۔ یہاں نہیں ملتی، چین میں مل جائے گی۔ ایک دوست کو معلوم تھا کہ چینی جوتا اچھا بناتے ہیں وہ اپنے پاؤں کا ناپ ہمیں دے گئے کہ بس دو جوڑے لیتے آنا۔ قیمت یہاں آنے پر نذر کروں گا، بشرطیکہ میرے ناپ

کا نکلے، ایک صاحب نے کہا پیکنگ کے تالابوں میں رنگا
رنگ کی مچھلیاں ہوتی ہیں، ایک مرتبان میرے لیے
بھر لائیو۔ ایک دوست ذرا روشن خیال قسم کے تھے۔ انہوں
نے فقط اتنی فرمائش پر اکتفا کی کہ کامریڈ ماؤزے تنگ سے
میرا اسلام کہنا اور بتا دینا کہ میں ان کے سیاسی خیالات سے
پوری طرح متفق ہوں۔''(۱)

ابن انشا چین کے سیاسی اور سماجی نظام کی تعریف کرتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ چین دنیا کی نظر میں افیمچیوں کا گڑھ تھا آج وہی چین جب اپنے خواب غفلت سے بیدر ہوا تو ترقی کی راہ اتنی قلیل مدت میں طے کیا کہ دنیا حیرت زدہ رہ گئی۔ چین ۱۹۴۹ میں سامراجی حکومت سے آزاد ہوا۔ اس کے بعد جو ترقی کی راہ پر گامزن ہوا تو دنیا کے ہر ملک کو پیچھے چھوڑتے ہوئے صف اول میں جگہ بنانے پر آمادہ ہے۔

جس تیز رفتار سے چین نے ترقی کی اسے دیکھ سب کچھ خواب کا گمان ہوتا ہے۔ اس ملک کی ترقی کو دیکھ ہمارے ذہن میں ایک سوال ابھرتا ہے کہ کیا کسی ملک کے سماج کا سیاسی نظام اتنا چست بھی ہوسکتا ہے۔ اتنی قلیل مدت میں کوئی ملک اتنا ترقی کر لے کہ جب کوئی سیاح دوسری بار اس ملک میں محض سولہ سال بعد آئے تو اس ملک کی ترقی کو دیکھ کر اسے کسی حسین خواب کے شرمندۂ تعبیر ہونے کا گمان ہوا۔ بھلا اس کائنات میں کوئی ایسی روئے زمین بھی ہے جہاں کا سماجی اور سیاسی نظام اتنا بلند ہو کہ وہاں کسی طرح کی بدنظمی ہی نہ ہو۔ یہ حیرت زدہ کارنامہ چین کے عوام نے انجام دیا تھا اور اس کا سہرا وہاں کے سیاسی اور سماجی کارکنوں کو دیا جانا چاہئے۔ اسی کے برعکس جب ہم ہندو پاک کے سماجی اور سیاسی نظام سے چین کا موازنہ کرتے ہیں تو ہمیں اپنے ملک کا سیاسی اور سماجی نظام چین سے ایک صدی پیچھے لگتا ہے۔ چین اور پاکستان میں کوئی تہذیبی یا سماجی مماثلت نہیں دکھائی دیتی۔ وہاں کے باشندوں کی زبان پاکستان کے لئے مکمل طور پر

---

(۱) ابن انشا..... چلتے ہو تو چین کو چلیے.....۲۰۰۱ء.....ص۔۱۰،۹

نا قابل فہم تھی۔ اتنا ہی نہیں ان کے رسم ورواج کا پاکستان کے معاشرتی رسومات سے دور کا بھی رشتہ نہیں تھا۔ ان تمام تفریق کے باوجود دونوں ملکوں کے سیاسی رشتے کافی استوار تھے۔ اس کا خاص سبب ہندوستان کے سیاسی حالات کا سازگار نہ ہونا ہے کیونکہ تقسیم ہند کے بعد سے ہی دونوں ملک ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے تھے اور دونوں کو ہی ایک دوسرے سے ہمیشہ خطرے کا اندیشہ بنا رہتا ہے نتیجتاً جہاں روس ہندوستان کو جنگی ساز وسامان فراہم کرتا وہیں چین اور امریکہ پاکستان کو، بہر حال جہاں تک چین اور پاکستان کے اچھے رشتے کا سوال ہے تو دونوں میں جو رشتہ ہے وہ سیاسی بنیاد پر ہے۔ اور اسی طرح ہندوستان کا بھی رشتہ روس سے ہے۔

ابن انشا کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے سفرناموں میں زندگی سے کہیں بھی فرار اختیار کرنے کا رجحان نہیں پیش کرتے بلکہ ان میں زندگی ہر جگہ حاوی اور غالب نظر آتی ہے۔ ان میں زندگی اور فن کا ایسا امتزاج ملتا ہے کہ جس سے حقیقت کے چہرہ سے نقاب خود بخود سرک جاتا ہے۔ انشا کے فن میں کوئی چیز کراماتی یا معجزاتی قسم کی نظر نہیں آتی۔ اخلاق اور معصومیت بلکہ اخلاص کی معصومیت ان کے فن کی امتیازی خصوصیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے سفرناموں میں کسی ملک یا شہر کا منظر کھینچتے ہیں، ان میں صداقت پائی جاتی ہے۔ لہذا اس کا استعمال وہ کچھ اس انداز میں کرتے ہیں کہ مزاح کا عنصر خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ہونٹوں پر ایک دلچسپ مسکراہٹ دوڑ جاتی ہے۔ انشا کے مزاج میں ایک طنز لطیف بھی موجود ہے جس سے معاشرتی تضادات اور انسانی رشتوں کی ناہمواریاں خود بہ خود آشکار ہو جاتی ہیں۔

انشا چین کی سیر وسیاحت کے وقت حیرت کے سمندر میں ڈوبے نظر آتے ہیں، وہ وہاں کی سائنسی ترقی سے لے کر وہاں کے سماجی معاشرے کی خوبیوں اور لوگوں کی بود باش تک کو حیرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ سیر وسیاحت کے دوران چین کے مثالی معاشرے میں انشا کو گھومنے پھرنے اور اسے قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا پورا موقعہ ملا یہ وہ مثالی معاشرہ ہے جہاں انسانیت کا انصاف اور سماجی انصاف پوری طرح جلوہ گر ہے اور یہی ہر عمل کی بنیاد ہے۔ انشا کے حیرت کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ انہوں نے جس چین کو سولہ سال پہلے

دیکھا تھا اس چین اور موجودہ چین میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ انشا کی چین سے والہانہ محبت نے انہیں ان سے ان کی معرکتہ الآرا نظم شنگھائی جو ۱۹۴۹ء یعنی کہ انکے دوسرے سفر کے سولہ سال پہلے لکھوائی۔ یہ نظم چین کے سب سے بڑے تجارتی مرکز اور دنیا کی سب سے بڑی بندرگاہ کے ماضی اور حال کی مکمل دردمندانہ تصویر ہے۔ یہ وہ عہد ہے جب شنگھائی اپنی شبینہ عشرت گاہوں اور کلبوں کے لیے مشہور تھا، انہیں کلبوں کے دروازوں کے آگے فٹ پاتھوں پر بہت سی معزور مائیں چھوٹے چھوٹے بچوں کو پیٹھ پر لے کر ہاتھ پھیلائے آواز لگاتیں کہ بابا ایک پیسہ دے جاؤ اور اپنی ماں کی انہیں آوازوں کو بچہ دہراتا تھا۔ ایسی افسوسناک تصویر آج بھی ہمارے ملک میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ لیکن چین نے آج اتنی ترقی کے وہ منازل طے کرلیں، کہ یہ سب تصویریں اس کے قصۂ پارینہ کا حصہ معلوم ہوتی ہیں۔ آج چین کا سیاسی نظام اتنا بدل گیا کہ چین نے ترقی کی سبھی منزلوں کو طے کرلیا۔ چین کے سیاسی اور سماجی شعور نے عوام کے اندر اس طرح سے بیداری پیدا کی کہ آج چین دنیا کے نقشے میں نمایاں نظر آتا ہے۔ شنگھائی جسے کبھی لوگ سنیئے چین کا ناسور کہتے تھے آج وہی شنگھائی چین کے دل کی دھڑکن ہے۔ ابن انشا ایک باشعور انسان تھے ان کی نگاہ ژرف بیں تھی۔ لہذا ان کی نظر چین کے معاشرے میں عام لوگوں کے رہن سہن پر زیادہ ٹکتی تھی، ان کو اس بات پر حیرت بار ہا ہوتی ہے کہ چینی عوام کی روزمرہ کی زندگی میں سہل نگاری اور کاہلی برائے نام بھی نہ تھی انشا چین کی ترقی کا سہرا وہاں کے سیاسی اور سماجی انقلاب کو دیتے ہیں جس نے جنم جنم کے افیمچیوں کو کردار کی وہ رفعت بخشی کہ آج اقوامِ عالم حیرت کے ساتھ مشرق سے ابھرتے ہوئے اس سورج کی کرنوں کو دیکھ رہی ہیں۔ ملک چین کی روداد بیان کرتے ہوئے ابن انشا ''چلنا ہے تو چین کو چلیے'' کہ مقدمہ میں فرماتے ہیں:

> ''یہ لوگ جو کچھ بتاتے ہیں وہ ایک خواب معلوم ہوتا ہے،
> ناممکن نظر آتا ہے، بھلا روئے زمین پر کوئی ایسا ملک بھی
> ہوسکتا ہے جس میں جرائم نہ ہوں، جنسی امراض ناپید ہوں،
> گندی بستیاں اور جھگیاں نہ ہوں، فضا اور پانی مسموم نہ ہوں،

عادی شراب خوار اور نشے باز نہ ہوں، حتیٰ کہ چھوٹے بڑے افسر اور ماتحت کا امتیاز بھی نہ ہو''..... بیشک جب تک اپنی آنکھوں کو نہ دیکھئے، یہ یقین نہیں آتا کہ کوئی ملک ترقی بھی کر رہا ہو اور ان الائشوں سے بھی محفوظ ہو جن کا اوپر ذکر آیا ہے۔ جہاں چور نہ ہوں اور لوگوں کو گھروں میں تالے نہ لگانے پڑتے ہوں، گرانی نہ ہو، ذخیرہ اندوزی نہ ہو، بیروزگاری نہ ہو، فحاشی نہ ہو، ٹھاہ ٹھاہ فلمیں نہ ہوں اور ملاوٹ نہ ہو، ٹریفک کے حادثے نہ ہوں اور جھوٹی اشتہار بازی نہ ہو، ہمہ گیر تعلیم کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور کا یہ حال ہے کہ ''نیوز ویک'' ہی کے الفاظ میں..... '': آپ کسی چینی دہقان سے کوئی سیاسی سوال کیجئے تو وہ معقول جواب دے گا۔ ایشیا کے کسی دوسرے ملک کے دہقان کی طرح بدھوؤں کی طرح منہ نہیں دیکھتا رہے گا''۔..... صحت کا یہ انتظام ہے کہ ڈاکٹر لوگ شاندار دفتروں میں نہیں بیٹھتے اور بیرون ملک نوکریوں کی تلاش نہیں کرتے، بلکہ لالٹین لیے، دواؤں کے بکس اٹھائے قریہ قریہ گھومتے رہتے ہیں۔ یہ وہی چینی لوگ تو ہیں کہ سر پر چوٹیاں رکھے افیم کے نشے میں غین رہتے تھے اور جن کی اخلاقیات کا ناک نقشہ اب بھی ہانگ کانگ اور سنگاپور کی گلیوں میں دیکھا جا سکتا ہے، لیکن یہ انقلاب، گراں خواب چینیوں کا اس طور پر سنبھلنا کہ

چمتکار معلوم ہوتا ہے، کوئی راتو رات کی بات نہیں، اس کے
پیچھے جدوجہد قربانیوں اور بے لوث قیادت کی ایک لمبی
داستان ہے۔''(۱)

یہ وہی چین ہے جو انقلاب سے پہلے افیمچیوں کے ملک کے نام سے مشہور تھا۔ آج اسی چین نے ایسے بلند پایہ مختلف کارنامے کو انجام دیا کہ دنیا اسے حیرت کی نظروں سے دیکھنے لگی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے چین دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں شمار ہونے لگا۔ ظاہر سی بات ہے جس ملک کے عوام کو اپنے فرض کا احساس ہو جائے تو اس ملک کی ترقی میں کوئی بھی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔ چینیوں کے اندر بیداری وہاں کے سیاسی اور سماجی نظام کی بدولت ہے اور یہی بیداری چینی عوام کو محنت کش اور سمجھدار بناتی ہے۔ یہی محنت اور سمجھداری اور ایمانداری چین کے عروج کا سبب ہے۔ جب انشا چین کو پاکستان کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو ان کو پاکستان کی یاد آتی ہے کہ کہاں پاکستان اور کہاں چین، پاکستان میں جتنی آزادی ہے چین میں کہاں، پاکستان میں پان کھایا اور سڑکوں کے کنارے یا بیچ میں کہیں بھی تھوک دیا اور جب پیشاب کی حاجت ہوئی سڑک کے کنارے کھڑے ہو گئے۔ لیکن چین میں یہ سب آزادی نہ ہونے سے ان کو اس بات کا شکوہ ہے کہ چینی لوگ آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں ہیں۔ یہاں اگر خریداری کرنے جاؤ تو ہر چیز کی قیمت متعین ہوتی ہے۔ بھاؤ تاؤ کرو تو دکاندار بس مسکرا دیگا۔ اسی کے برعکس پاکستان ہے جہاں بہت آزادی ہے اگر کسی سامان کی قیمت متعین ہے تب بھی ہم بھاؤ تاؤ کر سکتے ہیں اور کم کرا کے سامان خرید سکتے ہیں۔ یہ سب آزادی چین میں نہیں ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ بیرو کو بھی بخشیش لینے کی مناہی ہے اور ساتھ ساتھ دینے والوں کو بھی۔ ٹریفک کا حال یہ ہے کہ بس کو سڑک کے کنارے نہیں کھڑا کر سکتے نہ کسی سوئے ہوئے کے اوپر سے گزار سکتے ہیں اور نہ کسی بجلی کے کھمبے سے ٹکرا سکتے ہیں۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ چین اور پاکستان کے سیاسی اور سماجی نظام میں بے حد فرق ہے، یعنی بس یا ٹرک کو سڑک کے کنارے لگا کر یا کسی کے اوپر سے بس گزار کر بجلی یا ٹیلی فون کے

---

(۱) ابن انشا..... چلتے ہو تو چین کو چلیے ۲۰۰۱..... ص ۶۔۵

کھمبوں میں ٹکرا کر آرام سے بچ جاتے ہیں ویسا چین میں ناممکن ہے۔ انشا کے انداز میں اگر چینیوں کی برائی کی جائے تو یہ کہ نہ ان کو آزادی کی تعریف پتہ ہے، نہ مفت کی روٹیاں توڑنے کا ڈھنگ اور نہ ہی چوری وغنڈہ گردی کرنے کا طریقہ۔ انشا نے طنز ومزاح کے پہلو میں پاکستان کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی نظام کی بدنظمی پر چین کے توسل سے حملہ کیا ہے۔ انشا کا یہ حملہ طنز ومزاح میں اس طرح شامل ہے کہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ دل میں ایک سوئی سی چبھ جاتی ہے جس کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ انشا کا یہ انداز بیان ان کے سفرناموں کی جان ہے۔ انشا کی انشا پردازی کی پہچان بھی۔ یہ بات بھی درست ہے کہ انشا دوسرے ممالک کے معاشروں میں خیر ونیکی کی قدروں کی جستجو زیادہ کرتے ہیں۔ جب انشا کسی بلند تہذیب کا موازنہ کسی ادنیٰ تہذیب وتمدن سے کرتے ہیں تو اس تضاد سے وہ ایک بیساختہ مسکراہٹ کو جنم دیتے ہیں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''چین میں چار ہفتے کے قیام کے بعد ہم نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہاں آزادی کی سخت کمی ہے۔ ہمارے ایک ساتھی جو اپنے ساتھ پان لے کر گئے تھے بار بار فرماتے ہیں کہ یہ کیسا ملک ہے جہاں سڑکوں پر تھوک بھی نہیں سکتے۔ زیادہ دن یہاں رہنا پڑے تو زندگی حرام ہو جائے۔ ایک اور بزرگ نے فرمایا کہ یہاں کوئی دیوار ایسی نظر نہیں آئی جس پر لکھا ہو کہ ''یہاں پیشاب کرنا منع ہے'' جو اس امر کا بلیغ اشارہ ہوتا ہے کہ تشریف لائیے آپ کی حوائج ضروریہ اور غیر ضروریہ کے لیے اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ ایک صاحب شاکی تھے کہ یہاں خریدار کا لطف نہیں دوکاندار بھاؤ تاؤ نہیں کرتے۔ ہر چیز کی قیمت لکھی ہے کم کرنے کو کہیے تو مسکرا کر سر ہلا دیتے ہیں۔ ہوٹل کے بیروں کو

بخشیش لینے اور مسافر کو بخشیش دینے کی آزادی نہیں۔
بسوں اور کاروں کے اختیارات بے حد محدود ہیں۔آپ
اپنی بس کو فٹ پاتھ پر نہیں چڑھا سکتے، نہ کسی مسافر کے
اوپر سے گزار سکتے ہیں اور تو اور بجلی کے کھمبے سے ٹکرانے
تک کی آزادی نہیں اور بھی کئی آزادیاں جو آزاد دنیا کا
خاصہ ہیں وہاں مفقود نظر آئیں۔ گداگری ممنوع نائٹ
کلب ممنوع، جوئے پر قدغن ،کام نہ کرنا اور مفت کی
روٹیاں توڑنا خارج از امکان، لڑائی دنگا، چاقو زنی،
اغواوغیرہ کی وارداتیں اور خبریں نہ ہونے کے باعث
اخبارات سخت پھیکے سیٹھے۔ ملک کیا ہے، اچھا خاصا خوجہ
جماعت خانہ ہے۔''(۱)

تاریخ شاہد ہے کہ چین نے جس رفتار سے ترقی کی منزلیں طے کیں، وہ مثالی ہیں دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک کا چین سے اگر موازنہ کریں تو پتہ چلے گا کہ چین کا سیاسی اور سماجی دائرہ بہت وسیع ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انقلاب سے پہلے چین ہر طرح کی برائیوں میں غرق تھا لیکن انقلاب چین کے بعد وہ تمام برائیاں ختم ہوگئیں۔چین میں جسم فروشی پر پابندی لگادی گئی کیونکہ چینی نہیں چاہتے تھے کہ ان کی ماں بہنیں جسم فروشی کا دھندہ کریں۔ جو عورتیں جسم فروشی میں غرق تھیں انہیں علاج کے لیے شہروں سے نکال کر قصبوں اور دیہاتوں میں منتقل کر دیا گیا تا کہ وہ اپنے ماضی سے شرمندہ نہ ہوسکیں کیونکہ ماضی سے شرمندگی ان کے لیے جان لیوا ہوسکتی تھی۔ان کی نفسیات اور عادات واطوار کا جائزہ لے کر ان کو ایسے کارخانوں میں کام پر رکھا گیا جہاں صبح سے شام تک کام کرنا پڑتا تھا تا کہ ان کو اپنا ماضی یاد نہ آئے۔ان کی تعلیم کا اچھا بندوبست کیا گیا تھا

---

(۱) ابن انشا..... چلتے ہو تو چین کو چلیے ۲۰۰۱.....ص ۶۴_۶۳

تا کہ وہ جس ماحول سے آئی ہیں اس ماحول کی برائیوں کو سمجھ کر اچھے راستے اختیار کریں۔ وقت گزرتا گیا اور ان عورتوں کی زندگی میں خوشیاں آتی گئیں اور زندگی کی نئی شروعات نے ان میں اور اچھے کام کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا۔ لیکن جن عورتوں نے جسم فروشی کے دھندے کو ترک نہیں کیا ان عورتوں کو چین میں جگہ نہیں ملی ان عورتوں نے چین سے ہجرت کر کے ہانگ کانگ کو اپنا مسکن بنایا اور یہاں پر اپنی زندگی گزارتی رہیں۔ انشا کو چین کا ماحول بہت پسند آیا وہ جب چین کا موازنہ اپنے ملک سے کرتے ہیں تو ان کو اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ ان کا ملک ترقی کے لیے جس دور سے گزر رہا ہے اس میں سیاسی اور سماجی نظام حائل ہے اگر سیاسی اور سماجی نظام چین کی طرح ہو جائے تو پاکستان بھی بہت جلد ترقی کر جائے لیکن یہاں سیاسی نظام بدلنے والا نہیں کیونکہ یہاں کے عوام آرام پسند ہیں اور چین کے عوام آرام کو اپنے لیے حرام سمجھتے ہیں۔ جس ملک میں کوئی چھٹی ہوتی نہ ہو اس ملک کے لوگ کتنے محنت کش ہونگے۔ اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کو چھٹی اس لیے نہیں چاہئے کہ اب وہ اور نہیں سونا چاہتے کیونکہ انقلاب چین سے پہلے وہ سوتے آئے تھے اور انہوں نے بہت پریشانیوں کے بعد چین کو آزاد کرایا۔ چینیوں کے اندر بیداری کو دیکھ یہ احساس ہوتا ہے کہ چینی اپنی پچھلی زندگی یعنی ماقبل انقلاب کے حالات و کوائف سے بہت زیادہ شرمندہ ہیں۔ چینی کسی بھی دن کو چھٹی کا دن نہیں مانتے، وہ صرف اور صرف اپنے ملک کی ترقی کے خواہاں ہیں۔ تبھی تو انشا کہتے ہیں کہ چینیوں کو آزادی کے بارے میں کچھ پتہ ہی نہیں، حالانکہ اس جملے میں پاکستان کے نظم و نسق پر بھرپور طنز بھی ہے۔ چین میں بے شمار لوگ دوسرے ملکوں سے آتے ہیں اور طالب علم کی حیثیت سے یہاں قیام کرتے ہیں۔ کچھ ہی دنوں میں ان لوگوں کو اس ملک کے مزاج کا پتہ چل جاتا ہے۔ اور یہ طالب علم اسی حساب سے اپنے کو چین کے ماحول میں ڈھالنے (Adjest) کی کوشش کرتے ہیں۔ جو نہیں کر پاتے وہ اس ملک سے بیرنگ واپس اپنے ملک پہنچ جاتے ہیں۔ چینیوں کا سوچنا ہے کہ وہ اتنی مدت تک نکبت افلاس میں ملوث رہے کہ ان کی عزت ہی نہیں بچی تھی۔ لیکن اب وہ بیدار ہو گئے ہیں اور وہ کچھ ایسا نہیں ہونے دیں گے جس سے ان کی عزت ان کی نہ رہے۔ ابن انشا فرماتے ہیں:

''یہ بات انقلاب سے پہلے نہ تھی۔ انقلاب چین سے پہلے کاشنگھائی سینۂ چین کا ناسور کہلاتا تھا۔ چوری، ڈکیتی، قتل وغارت، اسمگلنگ کا تو اڈہ تھا ہی، قحبہ خانوں کے لیے بھی دنیا بھر میں مشہور تھا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ باتیں خواب وخیال ہوگئیں۔ وہاں ہفتے منانے کا دستور نہیں کہ ایک ہفتے کے لیے گداگروں کو محتاج گھر کے لئے اور چند دن میں وہ پھر کشکول بدمست مصنوعی زخموں پر مکھیاں بھنکاتے واپس آ گئے۔ نہ اکّا دکّا دعوت گناہ دینے والوں کو پکڑنے کی خبریں سننے میں آتی ہیں۔ چین میں جسم فروشی کو ایک معاشرتی روگ یا مجبوری جان کر اس کا علاج کیا گیا قحباؤں کو شہروں سے نکال کر قصبوں اور دیہاتوں میں منتشر کر دیا گیا جہاں ان کے ماضی کے ذکر سے شرمندہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ان کی نفسیات اور زندگی بھر کی عادات کو دیکھتے ہوئے ایسے کارخانوں میں متعین کیا گیا جہاں شام سے صبح تک کام ہوتا ہے اور دن میں لوگ آرام کرتے ہیں پھر ان کی تعلیم کا انتظام ہوا۔ رفتہ رفتہ انہوں نے زندگی کے رفیق ڈھونڈ لئے اور یوں معاشرے کا کارآمد اور صحت مند جزو بن گئیں۔ البتہ جن کا شوق لاعلاج تھا بالخصوص اس کاروبار پر چلنے والے انہوں نے نئے چین سے کنارہ کیا اور ہانگ کانگ میں آ کر دکانیں

جمالیں اور آتے ہی بیان دیا کہ نئے چین میں آزادی نہیں۔ جبر کا دور دورہ ہے اس لیے ہم آزاد دنیا میں سانس لینے کو یہاں آ گئے ہیں۔ ہمارے کرمفرما کا رلائقہ سے یاد فرمائیں.....چین میں بے شمار غیر ملکی جاتے ہیں یا بطور طالب علم رہتے ہیں۔ چند دن میں ان کو اس ملک کا مزاج معلوم ہو جاتا ہے۔ چینیوں کے جنسی بے راہروی کے معاملے میں اتنے متشدد ہونے کی ایک بڑی وجہ حفظ نفس ہے، قومی خودداری ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ہم اتنے دنوں تک نکبت وافلاس کا شکار رہے ہیں کہ ہماری عزت ہماری عزت نہیں رہی تھی، اب ہم بیدار ہوئے ہیں تو یہ کچھ نہ ہونے دیں گے۔ اب ہماری بہنوں، بیٹیوں کی طرف کوئی نظر اٹھا کر نہ دیکھ سکے گا۔ چینیوں کو اپنے ایشیائی اور افریقی دوستوں کی اتنی خاطر منظور رہتی ہے۔ اس کے باوجود فیلکس گرین بیان کرتا ہے کہ ایک افریقی طالب علم نے ایک چینی لڑکی سے جو بس کنڈکٹر تھی دلچسپی لینی شروع کر دی۔ وہ بس اسٹاپ پر کھڑا رہتا اور فقط اسی کی بس میں سوار ہوتا، اور اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا۔ ایک روز اس نے اس سے کہا کہ میں فلاں جگہ رہتا ہوں۔ ڈیوٹی ختم ہو تو ''پیتم آن ملو'' وہ تو خیر نہ آئی لیکن دوسرے روز ایک خط اس کو موصول ہوا کہ بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر آپ

کا وطن واپس چلا جانا ضروری ہے۔ وظیفہ آپ کا منسوخ
ٹکٹ آپ کا تیار ہے۔''(۱)

ابن انشا نے جس عہد میں یہ سفرنامہ لکھا اس عہد کی تہذیب وتمدن کا جب وہ جائزہ لیتے ہیں تو اس دور کی پوری عالمی تاریخ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ دنیا دوسری عالمی جنگ کے بعد پوری طرح برباد ہو چکی تھی اور آہستہ آہستہ دنیا کے تمام ممالک ترقی کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ دنیا کے انہیں ملکوں میں چین بھی اپنی منزل کی طرف تیزی سے قدم بڑھا رہا تھا۔ جاپان جو دنیا کے نقشے سے تقریباً غائب ہی ہو گیا تھا اس نے بھی ترقی کی منزلوں کو طے کیا اور ساتھ ہی ساتھ جرمنی جس نے دنیا کو برباد کرنے کی کوشش کی تھی دوسری عالمی جنگ میں خود پوری طرح برباد ہو گیا۔ لیکن جرمنی بھی تیزی سے ترقی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ انشا جب یورپ کے ملکوں کا سفر کرتے ہیں اور وہاں کے سیاسی اور سماجی ماحول کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کو احساس ہوتا ہے کہ ہندو پاک کی تہذیب وتمدن سے یورپ کی تہذیب وتمدن میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ یورپ میں شراب تمام ہوٹلوں میں ضرور ملیں گی۔ اور صرف ہوٹلوں کی ہی بات نہیں یورپ میں کسی بھی دکان پہ جائیں پانی نہ بھی ملے لیکن شراب ضرور ملے گی۔ اس کے برعکس اگر ہندو پاک کو دیکھا جائے تو یہاں شراب پینے والے کو بری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، چاہے وہ کسی مذہب کا ہو۔ انشا میونخ کے ہوٹلوں کا ذکر بہت خوبصورت انداز میں کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی انسان چاہے تو یہاں شراب آرام سے پی لے کوئی دیکھنے والا نہیں۔ ان کو اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ ہوٹلوں میں شراب کی بوتل مفت ملتی ہے۔ یورپ میں عریانیت ایشیا کے بہ نسبت زیادہ ہے وہاں عریانیت کو برا نہیں مانا جاتا یورپ میں بغیر شراب کے مہمان نوازی ممکن نہیں اس کے برعکس ہمارے یہاں میٹھا کھلا کر مہمان کی مہمان نوازی کی جاتی ہے۔ جس طرح کا کھلا پن انشا کے دور میں ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے ویسا کھلا پن ہندو پاک میں اب بھی دیکھنے کو کم ملتا ہے یورپ میں عورتیں جس انداز سے زندگی گزارتی ہیں اس انداز سے زندگی ہمارے یہاں گزارنا ناممکن تھا۔ وہاں

---

(۱) ابن انشا..... چلتے ہو تو چین کو چلیے ۲۰۰۱ء.....ص ۱۰۹۔۱۰۸

عورتیں چھوٹے اور باریک کپڑے پہنتی تھیں یا یوں کہیں کہ پہنتی ہی نہیں تھیں اور رات میں شراب کے نشے میں نائٹ کلب سے گھر واپس آتی تھیں۔ وہاں دکانداری کے پیشے میں زیادہ تر عورتیں ہوتی ہیں۔ حد تو یہ کہ اگر آپ یورپ میں مالش کے خواہش مند ہیں تو وہاں مالش کی دکانوں میں عورتیں مالش کرتی ہیں۔ ان چیزوں کو یورپ میں بالکل برا نہیں مانا جاتا کیونکہ ان کا ماننا ہے کہ کسی بھی ملک کی ترقی میں جتنا حصہ مرد کا ہے اتنا ہی عورتوں کا بھی ہے۔ ابن انشا جس خوش اسلوبی سے اس سماج کی تصویر کشی کرتے ہیں اس سے پورا منظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ یہ تصویر کشی ایک دور بیں انسان کے ہی بس کی بات ہے وہ جس موضوع پر گفتگو کرتے ہیں پوری تاریخ ہمارے سامنے گردش کرنے لگتی ہے۔ ایسی معلومات تو ہمیں صرف انشا کے سفر ناموں میں ہی مل سکتی ہیں۔ یہ شگفتگی تحریر ہر ایک کے بس کی بات نہیں کہ تہذیبی، سیاسی اور سماجی پابندیوں کے جالوں میں جکڑنے کے باوجود اپنی بات کہنے کا سلیقہ آتا ہو یہ تو ابن انشا کا طرۂ امتیاز ہے جو ہر فضا اور ہر ماحول کی عکاسی دلفریب اور حسین انداز میں کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ رقم طراز ہیں:

> ''میونخ میں ہماری بے نیازی کا فائدہ اٹھا کر ہمارا ایمان خراب کرنے کی کوشش کی گئی یعنی ہوٹل کے کمرے کے کونے میں شراب کی الماری رکھ دی گئی جس میں ہر طرح کی شراب کے شیشے تھے اور ہمارے لیے بالکل مفت تھے کیونکہ بل ہمارے میزبانوں کو دینا تھا۔ کئی بار جی میں آیا یہاں کون دیکھتا ہے۔ غٹ غٹ پی جائیں بعد میں کلی کرلیں گے۔ یوں بھی ہمارے سفرنامے میں اپنی پارسائی جو احوال ہم رقم کرتے ہیں۔ اس پر لوگ اعتبار تھوڑا ہی کرتے ہیں، لوگ اتنے بیوقوف تھوڑا ہی ہیں۔ لیکن افسوس ہمارے پورے شجرہ نسب میں کہیں کوئی قاضی نہیں ہے کہ

ہم اس کی آڑ میں اسے حلال کر سکتے، ہاتھ بوتل کی طرف
جونہی بڑھاتے ایک کڑکا سنائی دیتا تھا۔ظالم شراب ہے
،ارے ظالم شراب ہے، ناچار کوکا کولا یا کھاری سوڈا نکالتے
تھے۔اور اسے پی کر خود کو مبارکباد دیتے تھے۔کہ غالب
کے حساب سے ہم پورے مسلمان ہیں۔آٹھوں گانٹھ
مسلمان ہیں۔غالبؔ نے اپنے کو آدھا مسلمان لکھا تھا کہ
سور نہیں کھاتا، شراب پیتا ہوں۔ہم نہ یہ پیتے ہیں نہ وہ
کھاتے ہیں۔گویا ایک بات تو مرزا غالب سے برتری کی
ہم میں بھی ہے۔اب اسکی قدر کرنا نہ کرنا ابنائے زمانہ کا
کام ہے۔ہم کو نہ ستائش کی تمنا ہے نہ صلے کی پروا۔۔۔اس
کمرے میں ٹیلی ویژن بھی تھا جس کی وجہ سے ہم جتنے
دن میونخ میں رہے سنجیدہ موضوعات پر غوروفکر نہ
کر سکے۔اور بجلی کا مالشیا بھی۔جس سے ہم پارسال پیرس
میں استفادہ کر چکے ہیں۔یہ ایک ڈبہ سا ہوتا ہے۔جس
میں ایک مارک یا ایک فرنگ ڈالتے ہیں۔اور پندرہ منٹ
تک بستر پر تھرتھراہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ہماری رائے
میں یہ مالش بڑی حد تک نفسیاتی ہے۔مالش تو وہ ہیں جو
ہمارے ہاں ہوتی ہیں کہ مالش کرنے والا بدن کو (مالش
کرانے والے کے بدن کو) چپڑ کر پٹے کے ہاتھ چلاتا ہے
۔ بند بند کو جھنجھوڑ تا ہے، بھنبھوڑتا ہے۔ توڑتا ہے،

نچوڑتا ہے۔تھکن تو بیشک دور ہوجاتی ہے لیکن پہنچا اتر
جاتا ہے۔بانھ ہتھے سے اکھڑ جاتی ہے۔ناف ٹل جاتی ہے
یا آدمی بے ہوش ہوکر گر جاتا ہے۔ٹوکیو اور بنکاک کے
حماموں میں تو جہاں سب ننگے ہوتے ہیں۔مالش کا کام
طرح دار اور باعفت بیبیوں کے سپرد ہوتا ہے۔اور وہ
اس وقت تک اپنی عفت کو ہاتھ نہیں لگانے دیتیں جب
تک آپ انکو دس دس ڈالر مالش کی اجرت کے علاوہ نہ
دیں۔لیکن یہ مہینہ رمضان شریف کا ہے۔ہمیں اس قسم
کے ذکر اذکار سے گندی گندی باتوں سے اجتناب
کرنا چاہئے۔یوں بھی حمام کو غسل خانوں کی ذیل میں رکھا
جاسکتا ہے جس کے دروازے یعنی جس کے ذکر کے
دروازے ہم نے خود پر بند کرر کھے ہیں ہم نے اپنے آپ
میں اس قدر اصلاح کرلی ہے کہ خود ہم کو حیرت ہوتی
ہے۔''(۱)

سفرنامہ زندگی اور زندگی سے تعلق رکھنے والے تمام خارجی اور داخلی عناصر و اجزاء کی تفسیر بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔انشا نے اپنے تمام تجربات ومشاہدات کی روداد کو اپنے سفرناموں میں بیان کیا ہے۔ فن کار عام انسان سے زیادہ حساس اور وقت وحالات کا نباض ہوتا ہے۔وہ اپنے وقت کے مسائل سے بے نیاز ہوکر گوشہ نشینی اختیار نہیں کرتا بلکہ نامساعد حالات سے لڑتے ہوئے اپنے فن کی تخلیق کرتا ہے۔جس کے باعث اس کی تخلیق میں عصری حسیت کا ظہور ہوتا ہے جس کی وجہ سے بیشتر شعراء اور ادباء تمام حالات

---

(۱) ابن انشا.....ابن بطوطہ کے تعاقب میں ۲۰۰۱.....ص ۱۲۱ تا ۱۹۱

وحوادث سے اثر قبول کرتے ہیں۔ ابن انشا کا عہد ایک ہنگامی عہد ہے جس میں سیاسی، سماجی اور معاشرتی بحران موجود ہے۔ اس لیے ہم جب انشا کے عہد کے سیاسی اور سماجی پس منظر کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کی تحریروں میں ان کے عہد کا منظر رونما ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کا سب سے اہم اور عظیم سیاسی، سماجی اور معاشرتی سانحہ برصغیر کی تقسیم ہے۔ اس المیے سے آزادی کی مسرت خاک میں مل گئی اور متحد ہندوستان کی صدیوں کی مشترکہ تہذیب کا شیرازہ بکھر گیا۔ ہر طرف فرقہ وارانہ فسادات کو تقویت ملی، شرمناک اور دل سوز واقعات سامنے آئے جس کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ اس المیہ نے انسان کو انسان سے بھائی کو بھائی سے باپ کو بیٹے سے جدا کر دیا اس سے انسان کا ذہنی اور جسمانی سکون چھن گیا۔ لیکن وقت و حالات نے زخم پر مرہم لگایا اور لوگوں نے ان سب باتوں کو کسی طرح بھول کر ایک نئی زندگی کی شروعات کی۔ زندگی کی اس نئی شروعات نے نئے نئے واقعات و حوادث کو جنم دیا۔ لوگوں نے تقسیم وطن کے بعد نئے ملک میں نئی زندگی جینے کے یہ سپنے سجوئے تھے کہ پاکستان بن جانے کے بعد اپنا ایک وطن ہوگا جہاں ہر طرح کی آزادی ہوگی اپنی مرضی سے ہر کام کریں گے۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا لوگ سپنوں کی دنیا سے باہر آتے گئے سیاست دانوں نے ا۔ پنے مفاد کے لیے جن عوام کا استعمال کیا تھا وہی عوام اپنے حق کے لئے سیاست دانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ کسی بھی ملک کی ترقی میں اس سماج کا سیاسی نظام سب سے اہم رول ادا کرتا ہے۔ انشا کے سفرناموں کو جب ان کے عہد کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو وہ اپنے عہد کے ایک حساس اور نباض انسان کی شکل میں سامنے آتے ہیں ان کی آنکھیں اشیا کے باطن کو ٹٹولتی رہتی تھیں وہ جب اپنے ملک کا موازنہ دنیا کے دیگر ممالک سے کرتے ہیں تو ان کو اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ دنیا کے دوسرے ممالک جو دوسری جنگ عظیم میں بری طرح سے تباہ و برباد ہو گئے تھے وہ اتنی قلیل مدت میں ترقی کی ان تمام منزلوں کو طے کر لیا جہاں تک پہنچنے میں ہمارے ملک کو ابھی بہت انتظار کرنا پڑے گا۔ چین، جاپان، جرمنی نے جتنی تیزی سے ترقی کی اسے دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ اگر ہمارا ملک بھی ان ملکوں کی طرح ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے تو اسے منزل پر پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ لیکن ہمارے ملک کا سیاسی اور سماجی نظام پوری طرح سے

درہم برہم ہے۔ دیگر ملکوں کی طرح ترقی کی راہ ہمارے ملک کے لیے آسان نہیں ہے۔ جہاں دنیا کے دیگر ممالک میں ہفتے میں ایک چھٹی ہوتی ہے اور چین میں تو وہ بھی نہیں ہوتی۔ جبکہ ہمارے یہاں دو دن سرکاری چھٹی ہوتی ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ چین کے لوگ عیش وعشرت میں مبتلا نہیں ہوتے بلکہ اپنے کام میں مصروف رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اگر ان چھٹیوں پر تبصرہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ چھٹیوں سے صرف نقصان ہی ہے۔ نقصان اس وجہ سے کہ چھٹی کے دن اگر ہمارا کوئی ضروری کام پڑ جائے تو نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح اسپتالوں پر نظر ڈالیں تو احساس ہوتا ہے کہ اگر چھٹی کے دن کسی کی طبیعت خراب ہوجائے یا جو وقت اسپتالوں میں ڈاکٹروں کے آنے اور جانے کا متعین ہے اس وقت متعینہ کے علاوہ دوسرے کسی بھی وقت اگر کسی کی طبیعت خراب ہوجائے تو اسے بے حد پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر برصغیر کے اسپتالوں میں ڈاکٹروں کی کارکردگی کا عمومی جائزہ لیا جائے تو ان کی حالت بہت تشویشناک نظر آتی ہے حالانکہ لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ڈاکٹر، بھگوان کا دوسرا روپ ہوتا ہے۔ ایک بات قابل غور ہے کہ اگر کسی کو کتے نے کاٹ لیا اور اسے اسپتال جانا ہے، اس وقت اسپتال میں چھٹی کا دن ہے یعنی اتوار کا دن ہے تو وہ انسان کیا کرے گا۔ پھر وہ مرنے کی تیاری کرلے یا کتوں کو پوری طرح سے تعلیم یافتہ بنایا جائے تاکہ وہ وقت کی پابندی کا خیال رکھے اور متعین وقت یعنی اسپتالوں میں جو وقت مقررہ ۹ سے ۵ بجے کا اسی کے اندر کاٹے اور اتوار کے روز وہ کسی کو نہ کاٹے کیونکہ اتوار کا دن چھٹی کا دن ہوتا ہے اور اس چھٹی کے دن کا وہ بھی احترام کرے یعنی وہ بھی انسانوں کی طرح اتوار کو چھٹی منائے۔ لیکن کتوں کو تعلیم یافتہ کرنے سے پہلے اپنے ملک کے انسانوں کو تو تعلیم یافتہ کیا جائے یہاں تعلیم یافتہ لوگوں کی کمی اس حد تک ہے کہ لوگ خود سے بینکوں کا فارم نہیں بھر سکتے۔ ابن انشا ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''یہاں اخبار میں کسی کا مراسلہ چھپا ہے کہ صاحب اگر کسی کے دانت میں ہفتے یا اتوار کو جب ڈاکٹروں کی چھٹی کا دن ہوتا ہے، درد اٹھے تو وہ کیا کرے یہاں اسپتال ضرور ہیں

جوایمرجنسی کے کیس لیتے ہیں لیکن وہ بھی کہتے ہیں کہ آپ
کا جبڑا ٹوٹ گیا ہوتو بسم اللہ آیئے۔ دانت کا درد کوئی
ایمرجنسی نہیں ہے اسے ہم قبول نہیں کرتے .....ایک
بار ہم نے اپنے ملک میں کسی اسپتال میں یہ لکھا دیکھا تھا
کہ یہاں ۹ بجے سے پانچ بجے تک کتوں کے کاٹے کا
علاج ہوتا ہے۔ہم نے لوگوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ خود کتوں
سے صرف ان ہی اوقات کے اندر کٹوائیں کہ یہ ان ہی
کے مفاد کی بات ہے ،کٹوانے والوں کے مفاد
کی.....، کتوں کے مفاد کی نہیں۔ پھر کسی بھلے مانس
نے سوال اٹھایا کہ یہ مشورہ کتوں کو دنیا چاہیے کہ وہ صرف
ان اوقات کے اندر کاٹیں۔ لیکن اس میں چند
در چند قباحتیں تھیں۔ سارے کتوں کو گھڑیاں یا ٹائم پیس
فراہم کرنے پڑتے یا روزانہ نو بجے اور پانچ بجے توپ
چلانی پڑتی یا سائرن بجانا پڑتا پھر بھی کوئی ضروری نہیں کہ
کتے بات سمجھتے ۔اخباروں میں اعلان کیا جاسکتا تھا، پوسٹر
چھاپے جاسکتے تھے لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے
بہت سے کتے تعلیم یافتہ نہیں ہیں جس ملک میں اٹھارہ(۱۸)
فیصدی انسانوں کی تعلیم کی اوسط ہو اس میں کتوں کی تعلیم
کا زیادہ بندوبست مشکل ہے۔ ہم کبھی وزیر تعلیم بنے تو
ادھر توجہ کریں گے۔ یہ بات نہیں کہ سبھی کتے ان پڑھ

ہوتے ہیں جن لوگوں نے دکانوں پارکوں کے باہر نوٹس
لگا رکھے ہیں کہ یہاں کتوں کا داخلہ منع ہے، وہ بیوقوف
نہیں ہیں۔ ہم نے بعض کتوں کو دیکھا ہے کہ دم لہراتے
ذوق وشوق سے آئے اور جہاں یہ نوٹس دیکھا، پابندِ قانون
شہریوں کی طرح اپنا سا منھ لے کر اور دم ڈھیلی کر کے
واپس چلے گئے۔(۱)

اس اقتباس کی روشنی میں انشا نے تعلیم کا چرچہ کیا ہے کہ ملک کی سیاسی اور سماجی پالیسیوں کے تحت تعلیم کا معیار بد سے بدتر ہو گیا ہے۔ یہ سوچنے والی بات ہے کہ جس ملک کے ۱۸% فیصد لوگ تعلیم یافتہ ہوں وہ ملک کیسے اور کس طرح ترقی کرے گا۔ اس تشویشناک حالات کو دیکھ کر انشا کو بے حد افسوس ہوتا ہے اور ان کو اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اگر وہ وزیر تعلیم ہوئے تو تعلیم پر پوری طرح سے دھیان دیں گے۔ ہندو پاک کا تعلیمی نظام ایک جیسا ہے دونوں سیاست کے لیے جنگی سامان پر پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ عوام کو بیوقوف بنا کر اپنی سیاست چمکاتے ہیں۔ عوام کے جذبات کا فائدہ اٹھا کر ان کا دھیان دوسری طرف مرکوز کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ انشا کی نگاہ سماج کے اندر پھیلی برائیوں پر پڑتی ہے لیکن ان کے بیان کرنے کے انداز میں طنز وظرافت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے جس کی وجہ سے انسان ان کی انگلی پکڑے اپنے اوپر ہنستا ہے جس کا اسے اندازہ بعد میں ہوتا ہے تو وہ شرمسار ہو جاتا ہے۔ انشا کا یہی انداز بیان ان کے ہم عصروں میں ان کی انفرادیت کی غمازی کرتا ہے۔

ابن انشا کا سفرنامہ ''دنیا گول ہے'' بھی دلچسپی سے پر ہے ان کے دوسرے سفرناموں کی طرح یہ بھی مزاحیہ انداز میں لکھا گیا ہے۔ انشا نے طنز ومزاح کے جن حربوں کو اپنایا ہے اس کے استعمال سے ان کو بہت کامیابی ملی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انشا کو مزاح سے فطری لگاؤ تھا یہی فطری لگاؤ ان کے سفرناموں کی

---

(۱) ابن انشا.....نگری نگری پھرا مسافر ۲۰۰۱.....ص ۲۱۵۔۲۱۴

جان ہے۔ انشا نے مزاحیہ انداز میں پاکستان اور کابل کی سیاسی اور سماجی حقیقت کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس سے ان کے سفرناموں میں دونوں ملکوں کی معاشرتی حقائق خود بخود آشکارا ہونے لگتے ہیں۔ پاکستان اور کابل میں رمضان کی آمد کی خوشی میں ہوٹلوں میں لمبے لمبے پردے پڑ جاتے ہیں تاکہ دن میں جو لوگ روزے سے نہ ہوں وہ بھوکے نہ رہ سکیں۔ ان ہوٹلوں میں رمضان المبارک کا بہت خیال رکھا جاتا ہے کیونکہ روزہ کی بے پردگی ثواب میں کمی لاتی ہے اور ثواب میں کمی ایمان کی کمزوری کی علامت ہے۔ جہاں تک ابن انشا کا سوال ہے تو رمضان کے مہینے کی آمد کے نام سے ہی ان کو سفر کی حاجت محسوس ہونے لگتی ہے۔ ایسا کوئی بھی رمضان کا مہینہ نہیں جب انشا صاحب سفر پر نہ ہوں۔ ادھر رمضان کی آمد کی خوشی تو ادھر انشا صاحب کے بیرون ملک کے سفر کی خوشی۔ لیکن جانے سے پہلے اپنے ملک کو لوگوں کو ڈھیروں صلاح دے کر جاتے ہیں کہ وہ لوگ رمضان میں کسی طرح کی کوتاہی نہ کریں۔ ان کی باری جب آتی ہے تو وہ خود کو بچانے کے لیے فتویٰ جاری کر دیتے ہیں کہ سفر میں رمضان کی احتیاط رکھی جاتی ہے۔ انشا فرماتے ہیں:

> ''ہم اور رمضان شریف قبلہ کابل میں ایک ہی روز وارد ہوئے۔ پاکستان اس لحاظ سے افغانستان کے مقابلے میں پسماندہ ہے کہ یہاں ابھی ماہ شعبان چل رہا تھا پشاور سے ڈین ہوٹل کی میز بانی کا لطف اٹھاتے اور چلغوزے ٹھونگتے ہم جہاز میں سوار ہوئے تھے۔ لیکن پون گھنٹے بعد کابل کے خوبصورت ہوائی اڈے پر اترے تو پرچہ لگا کہ صاحبو۔ آج ہر طرف یکم رمضان کی تعطیل ہے۔ آپ کی باچھوں پر جو چلغوزوں کے چھلکے لگے ہیں۔ انہیں اچھی طرح صاف کر لیجئے..... روزوں کے متعلق اپنے افغان اور پٹھان بھائیوں کے متشدد رویے کا ذکر بھی ہم سن چکے تھے۔

بیشک ہوٹل جس میں ہم ٹھہرے وہ روشن خیال اور مغربی قسم کا تھا۔ تاہم لوگوں نے بتا رکھا تھا کہ سنا ہے وہاں تڑکے ہی مسافروں کو ٹانگوں سے گھسیٹ کر اٹھا دیتے ہیں اور بنوکِ شمشیر روزہ رکھواتے ہیں۔ الحمدللہ کہ یہ اندیشے بھی باطل ثابت ہوئے۔ ہم نے کابل کے ریستورانوں اور بھٹیار خانوں کو اسی طرح احترام کے پردے لٹکائے کاروبار کرتے دیکھا جیسا کراچی میں دیکھتے ہیں۔ ہم نے ایک آدھ بار روزہ رکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ہمارے ایک افغان دوست نے کہا کہ شوق سے رکھو ہم منع نہیں کرتے۔ لیکن اتنا دیکھ لو کہ تم سفر میں ہو اور سفر میں روزے کی احتیاط رکھی جاتی ہے۔ یہ لوگ ہمارے جذبۂ ایمانی کو اتنی ڈھیل نہ دیتے تو ہماری روزہ کشائی کی خبر کابل سے آتی۔(۱)

اس اقتباس کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ابن انشا اپنے عہد کی حقیقتوں سے پوری طرح باخبر تھے۔ ان کے عہد کی ہر آواز گردوپیش کی سیاسی، سماجی، اخلاقی اور تہذیبی فضا ان کی تحریروں میں نمایاں طور سے ملتی ہے۔ انشا کے شروع سے آخر تک کے جملے ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ ان کی نظر نہ صرف سیاسی اور سماجی اقدار پر ہے بلکہ ملک اور معاشرے کی کوتاہیاں بھی ان کے طنز و ظرافت کی لپیٹ میں ہوتی ہیں۔

سفر نامے کی تاریخ کا پر مزید جائزہ لینے پر یہ حقیقت خود بخود آشکارا ہو جاتی ہے کہ انشا اپنے سفر ناموں کو طنز و مزاح کی زد میں لاتے ہیں اور اپنی ذات کو لا کر خود پر دوسروں کو ہنسنے کا موقع دیتے ہیں لیکن

---

(۱) ابن انشا.....دنیا گول ہے ۱۹۹۹.....ص ۱۴۸۔۱۴۷

یہ ان کے فن کی چابکدستی ہے۔ان کے اس چابکدستی کا انکشاف ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب انشا کی ذات پر ہنسنے والے کو فوراً اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ ان کی انگلی تھامے انشا پر نہیں بلکہ اپنے آپ پر ہنس رہا ہے۔انشا کا یہی انداز بیان ان کو ان کے ہم عصروں میں ممتاز کرتا ہے۔ابن انشا کے یہاں انکشاف ذات کا خوبصورت انداز بیان ہوتا ہے۔ان تمام باتوں کی وضاحت خود انشا کی زبانی سنیے:

''ابن انشا نام نہ جانے ہم نے کب رکھا تھا اور کیوں رکھا تھا کی توجیہہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ ہمارے اصل نام میں ایک چوپائے کا نام شامل ہے۔ نیا نام رکھنے کا فائدہ یہ ہوا کہ لوگ انشا اللہ خاں انشا کی رعایت سے ہمیں بھی سید لکھنے لگے یعنی گھر بیٹھے ہماری ترقی ہوگئی۔اسی نسبت سے دلی والوں نے ہمیں اپنا ہم وطن جان کر ہماری زبان پر کم اعتراض کئے۔لکھنؤ والوں نے البتہ ہماری کے نقائص کے لئے اسی کو بہانہ لیا کہ ہاں دلی والے ایسی ہی زبان لکھا کرتے ہیں۔''(۱)

ابن انشا کے عہد میں پاکستان کا سیاسی اور سماجی نظام پوری طرح سے درہم برہم ہوگیا تھا ملک کے سیاسی رہنما سیاست کے ذریعہ اپنی روٹی سینکنے میں مصروف تھے ملک میں جنرل ایوب خاں کی آمرانہ حکومت تقریباً دس سال تک قائم رہی۔عوام ملک کے حالات کو سازگار نہ پاکر آزاد ہوتے ہوئے بھی اپنے کو غلام محسوس کررہی تھی۔ایوب خاں کے ہی دور حکومت میں مشرقی اور مغربی پاکستان علیحدہ ہوا اور ہندو پاک کی جنگ بھی انہیں کے عہد میں ہوئی وقت دن بدن گزرتا گیا لیکن سیاسی اور سماجی حالات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔پہلی بار شملہ سمجھوتے پر دستخط کرکے دونوں ملک کے درمیان دوستی کی بنیاد قائم کی گئی۔ہر طرف

---

(۱) ریاض احمد ریاض.....ابن انشا احوال وآثار.....۱۹۸۸.....ص ۸۷

خوش حالی تھی۔ دنیا کے سبھی ممالک نے دونوں ملکوں کو مبارک باد دی۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد کراچی میں فسادات ہوگئے۔ اور دھیرے دھیرے پورا پاکستان فساد کی زد میں آ گیا۔ اس آگ کو بجھانے کے بجائے دنیا کے دیگر ممالک اسے اور بھڑکانے کی کوشش کرنے لگے۔ اس تشویشناک حالات کی عکاسی انشا کے لفظوں میں:

> ''جس روز ہمارے صدر محترم ہندوستان کی وزیر اعظم کے ساتھ قرارداد شملہ پر دستخط کر رہے تھے، ہمارے قدم بھی نئی دہلی کی سرزمین پر تھے، شہر میں نہ سہی نئی دہلی کا ہوائی میدان اور ٹرانزٹ لاونج (یعنی آگے چلیں گے دم لے کر) بہر حال بھارت کی سرزمین ہی کا حصہ ہے.....
> ٹوکیو میں ہم پہلی صبح سو کر اٹھے۔ حالانکہ اس کے سات بجے کا مطلب یہاں تین بجے شب تھا تو اخبار میں شملے کی بیل منڈھے چڑھنے کی نوید تھی۔ جس کانفرنس میں ہم تھے اس میں ایشیا کے چودہ اور ملک تھے۔ سب نے خوشی کی قرار داد پاس کی اور اس میں ہمیں اور ہندوستان کے نمائندوں کو مبارکباد دی۔ اس سے اگلے روز کا اخبار کوریا کے دونوں حصوں میں یکجائی کے امکان کی خبر لایا۔ اب سب نے کوریا کے نمائندے مسٹر ہان کو بدھائی دی۔ اس سے اگلا روز جاپان کے لیے خوشی کا دن تھا کہ مسٹر تنا کا نئے وزیر اعظم ہوگئے جن کی آزاد خیالی سے چین کے ساتھ تعلقات استوار ہوتے نظر آئے۔ ہر روز کی تازہ نوید سے

ہم نے یہ خیال کیا کہ یہ ہمارے ملک سے باہر ہونے کی برکت ہے۔ ہم اپنی حکومت کو لکھنے والے تھے کہ ہمیں ملک سے باہر ہی رکھے تو اچھا ہے۔ اس میں ملک وقوم بلکہ ساری دنیا کا بھلا ہے۔ لیکن اگلا سنیچر جو آیا تو کراچی کے ہنگاموں کی خبر لایا۔ ٹوکیو میں انگریزی کے تین صبحگاہی اخبار ہیں۔ جاپان ٹائمز، ڈیلی منی اچی اور ڈیلی یوموہاری..... ہم انہیں اخباروں کے صفحوں میں تازہ خبر تلاش کرتے تھے۔ کسی روز تو ایک سطر بھی نہ ہوتی تھی کسی روز دو روز سے پہلے کی باتی بولتے تھے..... آخری روز جاپان ٹائمز نے لکھا کہ ۵۳ آدمی ہنگاموں کی نذر ہو چکے اور کراچی سے آگ دوسرے شہروں تک پہنچ گئی۔ یہ سطور بھی ہم وطن سے کئی ہزار کوس دور ہانگ کانگ میں لکھ رہے ہیں۔ دیکھیے ہمارے پہنچنے تک کیا ہوتا ہے..... کراچی کے ہنگامے اور فساد کی خبر یہاں کے بڑے اخبار ساؤتھ چائنا مارننگ پوسٹ میں آخری صفحے پر ہے۔ اور یہ کہ کرفیو کے باوجود لسانی فساد کے پانچویں روز بھی کراچی کی اجڑی بجڑی سڑکوں اور گلیوں میں مشین گن کی تڑاتڑ سنائی دیتی رہی۔ البتہ پہلے صفحے پر ایک خبر میں پاکستان کا نام زیادہ نمایاں طور پر آیا ہے، چار کالمی سرخی میں تصویر بھی ہے جس میں ایک ہاتھ میں جلتی ہوئی ماچس دکھائی گئی ہے۔ ہم یہی سمجھ

سکے کہ آتش زنی کی وارداتوں کی طرف اشارہ ہے۔سرخی
بھی کچھ دو معنی تھی۔ Pakistansnaapas
Match Sticks ۔ پڑھنے پر معلوم ہوا کہ ذکر فقط
ماچس کا ہے ماچس کی کارستانیوں اور تباہ کاریوں کا نہیں۔
خلاصہ خبر کا یہ کہ ہانگ کانگ کی ماچس فیکٹریوں کو پاکستان
کے تاجروں نے دیا سلائی کے اتنے آرڈر بھیجے ہیں کہ یہ
فیکٹریاں اوورٹائم لگا کر بھی اسے پورا نہیں کر پائیں۔
جو کچھ بناتی ہیں پاکستان بھجوا رہی ہیں۔حتی کہ ہانگ کانگ
میں ماچس کا کال پڑتا جا رہا ہے۔یہاں ہر دکان پر گاہک کو
ماچس مفت پیش کی جاتی ہے۔اب دوکانوں اور ہوٹلوں
والے آپ کا سگریٹ سلگا کر باقی ماچس اپنی جیب میں
رکھتے ہیں۔۔۔ اگلے بارہ ماہ کے لیے آرڈر بک ہیں۔
یعنی سارا سامان آتش زنی کا پاکستان ہی بھیجا جائے گا۔
خدا رحم کرے۔اور یہ بایں ہمہ ہے کہ پاکستان میں آج
کل ہانگ کانگ کے علاوہ بھی ہر ملک کی ماچس چل رہی
ہے۔ہر نئی دوکان پر نیا برانڈ اور اس پر کسی نئے ملک کا ٹھپہ
۔حالاں کہ اس وقت ہمیں ضرورت آگ کی نہیں، پانی کی
ہے اس بھڑکی ہوئی آگ کو بجھانے کے لئے۔''(۱)

سفر نامہ ادب کا حصہ ہے اگر ہم سفر نامہ کو ادب کا حصہ تسلیم کرتے ہیں تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ

---

(۱) ابن انشا.....ابن بطوطہ کے تعاقب میں ۲۰۰۱.....ص ۶۵ تا ۶۰

سفرناموں میں سماج کی بات ہوتی ہے۔ ادب سماج کا آئینہ دار ہے ادب کی تخلیق سماج سے ہوتی ہے اور ادب میں سماج کے ان تمام پہلوؤں پر غور کیا جاتا ہے جس سے سماج کا پورا نظام چلتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابن انشا کے سفرناموں میں سیاسی اور سماجی پہلو پوری طرح نمایاں ہے اور سب سے بڑی دلیل تو یہ ہے کہ انشا نے جتنے سفر کیے وہ سفر تمام تر سیاسی نوعیت کے تھے۔

ابن انشا کے تمام سفرناموں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات پوری طرح سے واضح ہوجاتی ہے کہ انہوں نے اپنے ملک کے ساتھ ساتھ ان ممالک اور دیار و امصار جن کا انہوں نے سفر کیا تھا ان کے سیاسی اور سماجی حالات و کوائف ان کے سفرناموں کا موضوع بن گئے ہیں۔ ان کے سفرناموں میں جغرافیائی حالات کے ساتھ ساتھ ان تمام سیاسی اور سماجی تحریکات کا ذکر بھی ملتا ہے جو عہد انشا میں مختلف ممالک میں رونما ہوئی تھیں اسی طرح وہ ان تحریکات کا موازنہ پاکستان سے بھی کرتے ہیں اور یہ دکھانے کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ دیگر ممالک کے مقابلے میں پاکستان کتنا پسماندہ ہے وہ پسماندگی کے اسباب و علل کا بھی سراغ لگاتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ پاکستان کی پسماندگی کا سبب دراصل وہاں کے لیڈروں کی مفاد پرستی ہے پاکستانی لیڈر وہی کچھ کرتے ہیں جن سے ان کا مفاد کارفرما ہوتا ہے۔ ابن انشا نے اپنے سفرناموں میں پاکستان کی پسماندگی کی ایک سب سے بڑی وجہ ناخواندگی پر بھی بڑے شدومد کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ وہاں صرف اور صرف ۱۸ فیصد افراد ہی تعلیم یافتہ ہیں ملک کی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں ہوسکتی جب تک کے وہاں کی خواندگی شرح میں اضافہ نہ کیا جائے۔ پاکستان کی بدحالی اور پسماندگی کا سبب وہاں کے عوام کا کام چور اور سہل انگار ہونا بھی ہے۔ وہ اتنے آرام طلب ہیں کہ ہفتے میں دو روز چھٹی کرتے ہیں اگر یہ دو روز کام میں صرف کیے جائیں تو ملک کی پسماندگی اور بدحالی میں ظاہر ہے کمی آئے گی اس طرح ابن انشا کے سفرنامے ایک تنقیدی دستاویز کی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں جس کا مقصد سماجی اور سیاسی حالات کوائف کی اصلاح کرنا ہے چونکہ ابن انشا ایک حساس اور نباض فن کار ہیں اس لیے وہ ملک کی سیاسی اور سماجی حالات کی دکھتی ہوئی رگوں پر آسانی کے ساتھ ہاتھ رکھ دیتے ہیں۔ ابن انشا کے سفرنامے کی

ایک حیثیت اس کی تاریخی حیثیت بھی ہے ابن انشا نے اپنے سفرناموں کے وسیلے سے اپنے ملک کے علاوہ دنیا کے دیگر ممالک کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی تاریخ لکھ دی ہے جو اگلے زمانے کے مورخوں کے لیے ہمیشہ نشان راہ کا کام کرتی رہے گی۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ انشا کے سفرنامے دراصل ان کے وقت کے سیاسی وسماجی حالات کے ساتھ ساتھ تہذیبی وثقافتی حالات کا بھی اشاریہ ہیں۔

باب سوم

ابن انشا کے سفرناموں کا

تجزیاتی مطالعہ

ابن انشا کے سفرناموں کا تجزیاتی مطالعہ

چلتے ہوتو چین کو چلیے:

چلتے ہوتو چین کو چلیے صرف ابن انشا کے ہی نہیں بلکہ اردو کے چند نمائندہ سفرناموں میں ایک ہے۔ یہ سفرنامہ ۱۹۶۷ء میں پہلی بار کتابی شکل میں منظر عام پر آیا اس کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں اس کے دوسرے ایڈیشن بھی شائع ہوئے، یہ سفرنامہ اس وقت وجود میں آیا جب انہوں نے ۱۹۶۶ء میں چین اور پاکستان کے ثقافتی وفود کے باہمی تبادلوں کے سلسلے میں پاکستانی ادیبوں کے ایک وفد کے ساتھ چین کا دورہ کیا۔ یہ ادیب وہاں تقریباً پچیس دن تک قیام پذیر رہے۔ ''چلتے ہوتو چین کو چلیے'' اسی سفر کی یادگار ہے۔ ابن انشا کی دوسری تحریروں کی طرح ہی یہ سفرنامہ بھی اخباری کالم کی صورت میں روزنامہ ''جنگ'' میں بالترتیب شائع ہوتا رہا۔

یہ سفرنامہ اردو کے دیگر سفرناموں سے اس لیے بھی مختلف ہے کہ اس میں جس ملک کو موضوع بنایا گیا ہے وہ بالکل اچھوتا ہے۔ عام طور سے جو سفرنامے لکھے گئے ہیں ان کا موضوع وسط ایشیا کے ممالک یا یوروپی ممالک رہے ہیں لیکن ان کے برعکس یہ سفرنامہ ایک ایسے ملک کی داستان دہرا رہا ہے جو ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں ریاض احمد ریاض لکھتے ہیں:۔

> ''اس سفرنامے کا موضوع نیا، ابھرتا ہوا چین، اس کی نئی فکر اور سوچ اور اس سے پیدا ہونے والی وہ عملی توانائی ہے جس کے بل پر وہاں زندگی کا ایک نیا انداز جنم لے چکا ہے اور دنیا چشم حیرت سے اس نئی ابھرتی ہوئی قوم کی طرف نگراں

ہے۔ ابن انشا کے اس سفرنامے کی پہلی خصوصیت تو یہی
ہے کہ یہ 'چین' کے بارے میں ہے کیونکہ ہمارے سفرنامہ
نگاروں کا زیادہ تر رجحان مغربی ممالک کے سیر وسفر کا رہا
ہے جہاں کچھ پہلے سے موجود ذہنی مرعوبیت اور کچھ وہاں
کی فی الحقیقت مادی ترقی کی چکاچوند سے آنکھیں چندھا
کر رہ جاتی ہیں۔ سیاحت کا دوسرا رجحان روم ومصر وشام کی
جانب تھا جہاں بنیادی مقصد اپنی عظمت رفتہ کی تلاش تھی۔
حج بیت اللہ اور مقامات مقدسہ کی زیارتوں کے سفرنامے
بھی ایک مخصوص عقیدت سے پڑھے گئے'' (۱)

انہوں نے اس حقیقت کا بھی اعتراف کیا ہے کہ اردو ادب میں چین سے متعلق لکھے گئے سفرناموں کی تعداد نہ کے برابر ہے۔ ''چلتے ہو تو چین کو چلیے'' چین سے متعلق لکھے گئے سفرناموں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

موضوع کے اعتبار سے بھی یہ سفرنامہ قابل مطالعہ ہے اور اسلوب کے لحاظ سے بھی اس میں جو موضوع اٹھایا گیا ہے وہ از کار رفتہ وہ پائمال موضوع نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق مقتضائے وقت سے ہے اور اس میں ایک طرح کا اچھوتا پن پایا جاتا ہے۔ ابن انشا نے جس ملک کو اپنے سفرنامے کا موضوع بنایا ہے وہ بھی برصغیر کی طرح عرصۂ دراز سے سامراجی پنجوں کی استبداد کا شکار تھا۔ چین کو بھی غلامی نے کھوکھلا بنا دیا تھا اس کے علم وہنر کو بھی ہر طرح سے تباہ وبرباد کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ چین جو کبھی اپنی حکمت کے لیے ساری دنیا میں مشہور تھا، اس کی حکمت خاک کا لقمہ بن گئی تھی۔ لوگوں کے حالات بد سے بدتر ہو گئے تھے جس کی وجہ سے کہیں بھی خوش حالی دیکھنے کو نہیں ملتی تھی۔ غرض کہ پورا چین تنزلی کے کگار پہ کھڑا تھا لیکن جیسے ہی آزادی ملی

---

(۱) ریاض احمد ریاض.....ابن انشا احوال وآثار ۱۹۸۸.....ص ۴۲۷۔۴۱۷

اس نے زندگی کے ہر شعبے میں اپنے آپ کو ترقی پذیر بنانے کی کوشش کی۔ نئے زمانے کے مطابق اس نے اپنے آپ کو ڈھال لیا جس کی وجہ سے اس کا شمار بھی دنیا کے ترقی پذیر ملکوں میں ہونے لگا۔ لیکن اس کے برعکس پاکستان میں آزادی ملنے کے بعد بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ آزادی برائے نام مل گئی لیکن یہ آزادی برگ و بار نہیں لا پائی۔ پاکستان کے رہنمائے سیاست نے ملک کی ترقی کرنے کے بجائے اپنی ترقی کی طرف زیادہ دھیان دیا۔ انہوں نے اپنے گھر بنوائے موٹریں خریدیں بینک میں پیسے جمع کیے۔ اس سلسلے میں ریاض احمد ریاض رقم طراز ہیں:

> ''مملکت پاکستان کا قیام ۱۹۴۷ء میں عمل میں آیا اور چین ۱۹۴۹ء میں سامراجی چنگل سے آزاد ہوا لیکن ایک قلیل مدت میں چین نے جس طرح ترقی کی منازل طے کیں اس نے اقوامِ عالم کو انگشت بدنداں کی کیفیت سے دوچار کر دیا۔ ابن انشا بھی اس عظیم اور وسیع و عریض مملکت کی سیاحت کے دوران حیرت کے سمندر میں ڈوبے نظر آتے ہیں۔ وہ چین کی سائنسی ترقی سے لے کر وہاں کی عمومی معاشرت کی خوبیوں اور لوگوں کی بود و باش تک کو حیرت سے دیکھتے ہیں، کہیں کہیں تو یوں نظر آتا ہے جیسے انہیں ایک مثالی معاشرے میں گھومنے پھرنے اور اسے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے، وہ مثالی معاشرہ جہاں احترام انسانیت، تمام قدروں کا عنوان اور سماجی انصاف جس کے ہر عمل کی بنیاد ہے۔ ابن انشا کی حیرت کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ وہ انقلاب سے پہلے کے چین سے بھی اچھی

طرح آشنا تھے اور ''چین اور چینیات سے شغف ان کا کوئی
نیا مشغلہ نہیں تھا''۔(۱)

''چلتے ہو تو چین کو چلیے'' ایک ایسا مرقعہ ہے جس میں بیک وقت چین اور پاکستان دونوں ملکوں کی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ دراصل ابن انشا چین کے حوالے سے پاکستان کے نظامِ سیاست و انداز معاشرت پر اس لیے تنقید نہیں کرتے ہیں کہ انہیں پاکستان سے کسی طرح کی کوئی دشمنی ہے اور وہ پاکستان کو دنیا کے نقشے میں رسوا کرنا چاہتے ہیں بلکہ ان کا مقصد اصلاح کرنا ہے۔ان کے سفرناموں میں اصلاحی پہلو نمایاں طور سے نظر آتے ہیں اور وہ ہنسی ہنسی میں رلانے کا فن بھی جانتے ہیں۔اخلاقیات اگرچہ ان کے سفرناموں میں ایک بنیادی چیز کے طور پر سامنے آتی ہے لیکن دوسرے لوگوں کی طرح وہ اخلاقیات کو خشک موضوع بننے نہیں دیتے بلکہ اپنے انداز بیان کی شوخی سے اس میں لطافت اور جاذبیت پیدا کردیتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''حکایت ہے کہ ایک پیر مرد دقیانوس، بڈھے پھوس، سنّر اسّی برس کا سن، اللہ اللہ کرنے کے دن، اپنے گھر کے باہر آموں کے پیڑ لگا رہے تھے، ایک راہگیر، تو کون میں خواہ مخواہ کھڑا ہو کر دیکھنے لگا امابعد بولا کہ بابا اب کے دن اور تمہاری زندگی ہے۔ان درختوں کا پھل کھانے کو زندہ تھوڑا ہی رہو گے، ناحق کو زحمت اٹھاتے ہو۔ بڑے میاں نے بھوؤں کی جھالریں ہٹا کر اجنبی کو دیکھا اور کہا کہ یہ تناور جفادری درخت جن کے پھل میں نے کھائے اور کھاتا

---

(۱) ریاض احمد ریاض......ابن انشا ...احوال و آثار ۱۹۸۸......ص ۷۴۵

ہوں، میرے پرکھوں نے لگائے تھے۔ میں جو لگا رہا ہوں
اس کا پھل میرے بچے پوتے کھائیں گے''۔(۱)

فنی اعتبار سے بھی ان کا یہ سفرنامہ قابل لحاظ ہے۔ اس میں جو سب سے بڑی بات نظر آتی ہے وہ مزاح نگاری کے تیکھے نقوش ہیں۔ ابن انشا مزاح سے جگہ جگہ پر کام لیتے ہیں اور وہ بات جو قابل قبول ہوتی ہے اس میں بھی مزاح کا عنصر داخل کر کے پر لطف بنا دیتے ہیں اور اس طرح ان کے تحریروں میں نشتریت پیدا ہو جاتی ہے۔ ابن انشا کے سفرنامے ''چلتے ہو تو چین کو چلیے'' سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''چین میں چار ہفتے کے قیام کے بعد ہم نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہاں آزادی کی سخت کمی ہے۔ ہمارے ایک ساتھی جو اپنے ساتھ پان لے کر گئے تھے بار بار فرماتے تھے کہ یہ کیسا ملک ہے جہاں سڑکوں پر تھوک بھی نہیں سکتے زیادہ دن یہاں رہنا پڑے تو زندگی حرام ہو جائے۔ ایک اور بزرگ نے فرمایا کہ یہاں کوئی دیوار ایسی نظر نہیں آئی جس پر لکھا ہو کہ ''یہاں پیشاب کرنا منع ہے'' جو اس امر کا بلیغ اشارہ ہوتا ہے کہ تشریف لائیے آپ کی حوائج ضروریہ اور غیر ضروریہ کے لیے اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں، ایک صاحب شاکی تھے کہ یہاں خریداری کا لطف نہیں دوکاندار بھاؤ تاؤ نہیں کرتے۔ ہر چیز کی قیمت لکھی ہے کم کرنے کو کہیئے تو مسکرا کر سر ہلا دیتے ہیں۔ ہوٹل کے بیروں کو بخشیشیں لینے اور مسافروں کو بخشیشیں دینے کی آزادی نہیں۔ بسوں اور کاروں کے اختیارات بھی بے حد محدود ہیں۔ آپ اپنی بس کو فٹ پاتھ پر نہیں چڑھا سکتے، نہ کسی مسافر کے اوپر سے گزار سکتے ہیں۔ اور تو اور بجلی کے کھمبے سے ٹکرانے تک کی آزادی نہیں، اور بھی کئی آزادیاں جو آزاد دنیا کا خاصہ ہیں

---

(۱) ابن انشا..... چلتے ہو تو چین کو چلیے ۲۰۰۱..... ص ۲۵

وہاں مفقود نظر آئیں۔ گداگری ممنوع، نائٹ کلب ممنوع، جوئے پر قدغن، کام نہ کرنا اور مفت کی روٹیاں توڑنا خارج از امکان، لڑائی دنگا، چاقو زنی، اغوا وغیرہ کی وارداتیں اور خبریں نہ ہونے کے باعث اخبارات سخت پھیکے سیٹھے۔ ملک کیا ہے، اچھا خاصا خوجہ جماعت خانہ ہے''(۱)

اس سفرنامے میں جیسا کہ ظاہر ہے طنز و مزاح کا تیکھا پن غالب طور سے موجود ہے لیکن اس تیکھے پن میں بالخصوص اس حصے میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا ہے جہاں انہوں نے ایک ہی کردار میں کئی طرح کی ناہمواریوں کو اپنے طنز و مزاح کے ذریعے تنقید کا نشانہ بنایا ہے ایسے موقعوں پر انہوں نے ایسی شخصیات کو اپنے طنز و مزاح کا موضوع بنایا ہے۔ جو ان کے شریک سفر تھے یا ان کے اندر پائے جانے والے عادات و خصائل کو مرکز بنا کر ایک لطیف طنز پیدا کر دیا گیا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہمارے ساتھ ڈاکٹر وحید قریشی بھی تھے جو تحقیق کے مرد میدان ہیں۔ اور کسی کتاب کو ہاتھ نہیں لگا لئے تا آنکہ اس کو دیمک نہ چاٹ گئی ہو۔ شعبۂ اردو کی لائبریری میں ہم نے اردو ادب کی بہت سی کتابیں دیکھیں درخوش ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب سے بھی کہا کہ آپ بھی خوش ہو جیئے۔ اقبالؔ ، جوشؔ، سرشارؔ، شررؔ اور غالبؔ سب موجود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کوئی مخطوطے بھی ہیں آپ کے پاس یہ لفظ چینی طالب علموں کے لیے شاید نیا تھا۔ اس لیے ہم نے سمجھایا کہ وہ کتابیں جن کو پبلشر نہ ملیں آخر میں مخطوطہ کہلاتی ہیں ہمارے چینی میزبانوں نے بہت معذرت کی کہ نہیں ہمارے پاس حاتمؔ اور قائمؔ اور ولی اور پچھیؔ نرائن شفیق کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کوئی تحریر نہیں۔ اس پر

---

(۱) ابن انشا..... چلتے ہو تو چین کو چلیے ۲۰۰۱..... ص ۶۴۔۶۳

ڈاکٹر صاحب بے تعلق ہوکر بیٹھ گئے کہ یہ مبتذل مطبوعہ کتابیں تم دیکھو۔
میرے کام کی نہیں''۔(۱)

''چلتے ہوتو چین کو چلیے'' کے مطالعہ کے بعد ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ ابن انشا نے جہاں موضوعات کی سطح پر اپنی تحریروں میں تنوع اور ندرت پیدا کی ہے، وہیں ان کا اسلوب بھی خاصا دامن کش دل ہے۔ان کے اسلوب میں بلا کی لطافت اور شگفتگی ہے۔ جملے نہایت ہی نپے تلے ہوتے ہیں اور اس میں کوئی بھی لفظ بھرتی کا نظر نہیں آتا ہے۔ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی ان کا بے تکلف اور بے ساختہ انداز ہے، اور یہ چیز بڑی محنتوں کے ساتھ تحریروں میں آپاتی ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں عربی فارسی کے نامانوس الفاظ کا استعمال قطعی نہیں کرتے، بلکہ وہ اپنے جملے کی ساخت انہیں لفظوں کے سہارے کرتے ہیں جو ہمارے روزمرہ کے حصے ہیں۔

تکنیک کے اعتبار سے بھی یہ سفرنامہ کامیاب ہے۔ یہ روزنامچے کے فارم میں لکھا گیا ہے اور کتاب کے مطالعہ کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ روزنامچہ کے مختلف اوراق کو ایک جگہ ترتیب دے دی گئی ہے، لیکن اس کے باوجود اس میں جو ربط و تسلسل ہے وہ دوسرے سفرنامہ نگاروں کے یہاں شاذ و نادر ہی ملیں گے۔

آوارہ گرد کی ڈائری:

''آوارہ گرد کی ڈائری'' ابن انشا کا وہ سفرنامہ ہے جسے انہوں نے اس وقت لکھا جب پاکستان نیشنل بک سینٹر کی سربراہی میں انہیں یونیسکو سے رابطہ ہوا اور دنیا کے مختلف ملکوں کی سیاحت کا موقع ہوا۔ یونیسکو کے پروگراموں کے سلسلے میں انہیں دنیا کے بہت سے ملکوں کی سیاحت کرنی پڑی۔ان میں یورپ کے ممالک بھی شامل ہیں اور ایشیا کے بھی، بالخصوص وسط ایشیا کے ممالک۔ دوران سفر انہوں نے جو کچھ دیکھا اور اس سے جو کچھ تاثر قبول کیا اس کو انہوں نے مختلف اوقات میں اخباری کالم کی صورت میں لکھنا شروع کیا جو بالکل ہی ہنگامی نوعیت کی چیز ہے۔ یہ تحریریں بالاقتباس اخبار میں شائع ہوتی رہیں۔ کتابی

---

(۱) ابن انشا..... چلتے ہوتو چین کو چلیے ۲۰۰۱..... ص ۵۷۔۵۶

شکل میں یہ تحریریں ۱۹۷۱ میں منظر عام پر آئیں۔ اس سلسلے میں خود ابن انشا نے لکھا ہے:

''اصل میں یہ اس قسم کا سفر نامہ نہیں، جو سفر کے اختتام پر لکھا جاتا ہے۔ یہ تو ایک آوارہ گرد کی ڈائری کے منتشر اوراق ہیں۔ ۱۹۶۷ کے اواخر میں ہم یونیسکو کی دعوت پر یورپ اور مشرق وسطیٰ کے ملکوں کے دورے پر گئے تھے۔ وہاں جو کچھ ہم پر، اور ان ملکوں پر ہمارے ہاتھوں گزرتی رہی بے کم و کاست رقم کر کے اخبار میں بھیج دیا کرتے تھے پچھلی قسط میں کیا لکھا تھا یہ کبھی یاد نہ رہا۔ چونکہ ہمیں جم کر لکھنے کی کبھی عادت نہیں رہی۔'' (۱)

ابن انشا کے مندرجہ بالا اقتباس سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ 'آوارہ گرد کی ڈائری' کب لکھی گئی اور اس کی نوعیت کیا ہے۔ ڈاکٹر ریاض نے بھی 'آوارہ گرد کی ڈائری' کی شان نزول پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''پاکستان نیشنل بک سینٹر کی سربراہی کے زمانے میں ابن انشا کا اقوام متحدہ کے بین الاقوامی ادارے یونیسکو سے رابطہ قائم ہوا تو انہیں اس تنظیم کے مختلف پروگراموں کے سلسلے میں دنیا بھر کی سیاحت کے مواقع میسر آئے۔ اب یہ ان کا کمال تھا کہ انہوں نے موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا..... یونیسکو والوں نے انہیں سب سے پہلے ایران اور لنکا کے سفر پر بھیجا۔ یہ بات دسمبر ۱۹۶۳ء اور جنوری ۱۹۶۴ء کی ہے، پھر تہران میں

---

(۱) ابن انشا.....آوارہ گرد کی ڈائری ۲۰۰۱.....ص ۶۔۵

بچوں کا میلہ ہوا تو اس میں گئے۔ آوارہ گرد کی ڈائری کے سفر ۱۹۶۷ میں پیش آئے۔ جب مذکورہ بالا ادارے نے انہیں یورپ اور مشرق وسطیٰ میں کتابوں کی اشاعت اور تقسیم کے نظام کے ایک طویل مطالعاتی فیلو شپ کے لئے منتخب کیا۔ اس فیلوشپ کے دوران، ان کا زیادہ وقت لندن میں گزرا، بعد ازاں مختلف سیمیناروں اور جلسوں میں شرکت کے لئے جرمنی، فرانس، ہالینڈ، سوئزر لینڈ، پراگ اور وارسا وغیرہ کے پروگرام رہے، پھر مصر میں قاہرہ اور لبنان میں بیروت کے مختلف اشاعتی ادارے دیکھے۔ ستمبر تا دسمبر ۱۹۶۷ء کے لگ بھگ تین مہینوں کی اس سیاحت نے آوارہ گرد کی ڈائری کو جنم دیا، یہ بھی حسب سابق دراصل وہ کالم تھے جو ممالک غیر سے بھیجے گئے اور یہاں اخبار میں چھپتے رہے، سفری کالموں کا یہ مجموعہ پہلی بار جولائی ۱۹۷۱ء میں منظر عام پر آیا"۔(۱)

ریاض احمد ریاض کی کتاب سے ماخوذ مندرجہ بالا اقتباس سے آوارہ گرد کی ڈائری کے معرض وجود میں آنے کا پورا پس منظر معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ اخباری کالموں کے ٹکڑے کی صورت میں لکھا گیا، جس کا اعتراف خود ابن انشا نے بھی کیا ہے۔ اس طرح یہ ایک ہنگامی اور وقتی نوعیت کی تحریر ہوئی، لیکن اس کے باوجود اس میں پوری ادبی شان پائی جاتی ہے۔ اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ جو چیز ہنگامی صورت حال میں قلم برداشتہ لکھ دی جاتی ہے، اس میں ادبیت شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ یہ ابن انشا کے جادو نگار

---

(۱) ریاض احمد ریاض.....ابن انشا احوال و آثار ۱۹۸۸.....ص ۵۵۷

اور سحر طراز قلم کا کمال ہے کہ وہ ہنگامی اور وقتی تحریروں میں بھی ادبیت پیدا کر دیتا ہے۔ 'آوارہ گرد کی ڈائری' میں مختلف تہذیبوں کی عکاسی ملتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں کسی خاص ملک یا کسی خاص علاقے کو موضوع نہیں بنایا گیا، بلکہ ابن انشا نے اس کو تحریر کرتے وقت جن جن ملکوں کی سیاحت کی ہے، ان سبھوں کے بارے میں اپنے تاثرات رقم کئے ہیں۔ وہ 'سنڈے' اخبار کے حوالے سے لندن کی معاصر تہذیب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سنڈے آبزرور نے بھی ایک لمبا چوڑا مضمون چھاپا ہے۔'' کیا شادی کا رواج ہماری نسل کے ساتھ ختم ہو جائے گا؟ یعنی آئندہ لوگ رہا کریں گے میاں بیوی کی طرح لیکن شادی کھکھیڑیں اٹھائے بغیر''۔ آبزرور نے آنے والے دور کی دھندلی سی یہ تصویر دکھاتے ہوئے اس کی وجہ بیان کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ شادی کی جاتی تھی معاشرتی اور اقتصادی تحفظ کے لئے۔ عورت شادی نہ کرتی تو کھاتی کہاں سے؟ شادی کے تصور کو کچھ تقویت مذہب سے ملتی تھی اور کچھ رومانی ناولوں سے۔ اب لوگوں کی عمریں لمبی ہوگئی ہیں۔ ایک ساتھی کے ساتھ اتنی بڑی جنسی زندگی گزارنا دشوار ہے لڑکے لڑکیاں اب بلوغت کو بھی جلد تر پہنچتی ہیں اور شادی سے پہلے جنسی تجربہ اب ایک قدرتی اور مسلمہ بات گنی جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جارہی جو شادی کے بعد مکمل جنسی وفاداری کی نہ توقع کرتے ہیں نہ اسے اہم جانتے ہیں۔ اب شادی عورت کا

معاشی سہارا بھی نہیں ۔ وہ خود جو کماؤ ہے۔ نئے
واعظین اخلاق (الیکس کمفرٹ وغیرہ) کا کہنا ہے کہ
ایک مرد یا عورت اپنے شریک زندگی کے ساتھ کسی کسی
دوسرے سے بھی مخلصانہ محبت کرسکتا ہے یا کرسکتی ہے۔
اس میں بے وفائی کی کوئی بات نہیں۔ دونوں سے وفا
ممکن ہے۔ظاہر ہے ان واعظین کے تصور عشق میں
جنسی واردات بھی شامل ہیں''۔(۱)

ابن انشا کے سفرنامے آوارہ گرد کی ڈائری سے ماخوذ اس اقتباس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ وہ صرف اور صرف کسی ملک کی تہذیب کو من وعن ضبط تحریر میں نہیں لاتے، بلکہ اس پر ایک ناقدانہ نگاہ بھی ڈالتے ہیں اور اس سے نتیجہ بھی اخذ کرتے ہیں۔ نتیجہ اخذ کرنے کے مرحلے میں مقابلہ اور موازنہ سے بھی کام لیتے ہیں۔لندن اور پیرس کے معاصر تہذیب کا موازنہ کرتے ہوئے ابن انشا لکھتے ہیں:

''حسن کی شوخیاں اور عشق کی گرمیاں یورپ کے لئے نئی
بات نہیں۔اب تو پردے پر پردہ اٹھ رہا ہے۔لیکن اتنا ہم
کہیں گے کہ پیرس میں لندن کا سا ابتذال نہیں۔لندن
میں تو سیدھی سادی جسم فروشی ہوتی ہے۔ پیرس میں لب
وکنار کی دعوتیں ضرور ہوتی ہیں: ع

چھاتی سے لگا چوم لیا، ہوگئے چپکے

لیکن غنڈہ گردی اور بیسوا پن نہیں۔ عاشقی بھی سلیقے کی اور
فاسقی بھی سلیقے کی''(۲)

---

(۱) ابن انشا.....آوارہ گرد کی ڈائری ۲۰۰۱.....ص ۸۴
(۲) ایضا.....ص ۲۱

اس طرح کے بہت سے اقتباسات پیش کئے جاسکتے ہیں جن میں ابن انشا نے مختلف ملکوں کی معاصر تہذیبوں پر روشنی ڈالی ہے۔ دراصل ابن انشا باریک بیں سفرنامہ نگار ہیں جو اشیا کے باطن پر نگاہ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا سفرنامہ صرف اور صرف واقعات کا بیان نہیں ہوتا، بلکہ اس میں واقعات کے خارجی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ باطنی پہلو بھی شامل ہوتے ہیں۔

" آوارہ گرد کی ڈائری" میں اکثر و بیشتر ان کا لہجہ ظریفانہ ہے۔ لیکن اس میں ایک باب ایسا بھی ہے جہاں اپنے مزاج کے برعکس ابن انشا خاصے سنجیدہ نظر آتے ہیں، اور وہ باب ہے ''ایک شام ماضی کے محرابوں میں''۔ دراصل اس باب میں ان کا عقیدت مندانہ جذبہ جگہ جگہ پر دکھائی دیتا ہے جو ان کے لہجے کو متاثر کرتا ہے۔ اس باب میں ابن انشا جذباتی ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، حالانکہ جذباتیت ان کی تحریروں کی خصوصیت نہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''دمشق اس وقت بھی آباد تھا۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے دینِ حق کی منادی کی۔ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے عہد میں بھی یہ رونق پر تھا۔ آشوریوں اور ایرانیوں کے روایت بھی اس کی فصیلوں پر لہرائے اور سکندر اعظم کے بعد اہل مقدونیہ بھی یہاں اپنا سکہ چلا گئے۔ چودھویں سنہ ہجری میں خالد بن ولید کے ہمراہ عبیدہ بن جراح اور یزید بن ابی سفیان کے ہاتھوں یہ فتح ہوا۔ خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ کے عہد میں اس کی حکومت امیر معاویہ کے ہاتھ میں تھی اور ۴۰ھ سے یہ امویوں کا پایۂ تخت اور تمام دول اسلامیہ کا مرکز بن گیا لیکن یہ طرۂ امتیاز اس کی دستار میں فقط صدی بھر کو رہا۔ مصر میں خلافت عباسیہ منتقل ہونے کے بعد کبھی یہ

مصر کے تابع رہا۔ کبھی بغداد کے۔ سلجوقیوں کی بعض شاخیں
بھی اس پر کچھ دن حکومت کر گئیں۔ اور پھر ہلال وصلیب
کے معرکے برپا ہونے شروع ہوئے۔ یہ مدرسہ ظاہریہ ہے
جس کے اندر ملک الظاہر کا مقبرہ ہے۔ یہ مدرسہ عالیہ ہے۔
جہاں ابن خلکان درس دیتے تھے یہ مدرسہ افتائیہ ہے۔ یہ
مدرسہ، ڈیوڑھیاں اور محرابیں اور طاق جن میں کوڑا کرکٹ
کے ڈھیر ہیں اور ڈیوڑھیاں جن میں سے اندھی اندھی
گلیاں جانے کدھر نکل گئی ہیں''۔(۱)

اس اقتباس سے یہ شق بھی ابھرتی ہے کہ ابن انشا کو تاریخ سے بھی نسبت خاص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس طرح کے تاریخی حوالے دئے ہیں۔ ساتھ ہی یہاں ان کا لہجہ خاص سنجیدہ اور محققانہ نظر آتا ہے۔

اب وہ حصہ ملاحظہ ہو جہاں وہ حد درجہ عقیدت میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں:

''دمشق تو گنج شہیداں ہیں چلو فاتحہ پڑھو۔ حضرت بلال
حبشیؓ کے مزار پر۔ عبداللہ بن مکتومؓ کی تربت پر، عمر بن
عبدالعزیز کی قبر پر۔ سیّدہ زینب۔ سیّدہ سکینہ۔ اسما بنت
ابوبکر۔ سیّدہ فاطمہ صغیرہ بنت امام حسینؓ۔ ان قبرستانوں
کے پھیلے ہوئے کھنڈروں میں کس کس موتی کو تلاش
کروگے.....اور پھر ایک طرف سے تلاوت کی شیریں آواز
آنی شروع ہوئی۔ اے دمشق رخصت۔ اے جامع اموی۔

---

(۱) ابن انشا.....آوارہ گرد کی ڈائری ۲۰۰۱.....ص ۳۰۱۔۳۰۰

اے عظمت رفتہ کی سجدہ گاہ السلام۔لیکن ابھی کہاں۔ابھی تو
دمشق کی گلیاں باقی ہیں۔ہم نے سڑک پار کی اور درویش
پاشا کی تربت کے پاس سے کاوا کاٹ کر پھر اندھی گلیوں کی
محرابوں میں گم ہو گئے''۔(۱)

'آوارہ گرد کی ڈائری' فنی اعتبار سے بھی ایک کامیاب سفرنامہ ہے۔اس میں روز نامچے کی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔یہ مختلف نشست میں لکھی گئی تحریروں کا مجموعہ ہے،اس کے باوجود اس کی تمام کڑیاں ایک دوسرے سے اس قدر مربوط اور منسلک ہیں کہ یہ گمان ہی نہیں ہوتا کہ یہ مختلف نشستوں کی تحریروں کا مجموعہ ہے۔

زبان و بیان کی سطح پر بھی 'آوارہ گرد کی ڈائری' کامیاب سفرنامہ ہے۔اس کی زبان رواں دواں ہے اور لہجہ بھی شگفتہ ہے جو قاری کو باندھے رکھنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ابن انشا نے ظرافت اور طنز و مزاح سے پورے سفرنامے کے ماحول کو خوشگوار بنا دیا ہے،لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس میں کہیں کہیں سنجیدہ اسلوب بھی استعمال کیا ہے۔سنجیدہ اسلوب میں بھی بلا کی تازگی ہے۔اسی کے ساتھ ساتھ اس میں بھی دل کو چھو لینے والی صلاحیت موجود ہے۔جس سے یہ پتا چلتا ہے کہ ابن انشا نے اگر جذباتی اسلوب کو بھی اپنے سفرناموں کے لئے استعمال کیا ہوتا تب بھی کامیاب ہوتے۔

ابن انشا کے سفرنامے 'آوارہ گرد کی ڈائری' کی ایک اور خوبی ہے جو ان کے دوسرے سفرناموں میں بھی موجود ہے کہ وہ واقعات کے چھوٹے بڑے تمام جزئیات کو برسرعام لاتے ہیں اور ان سے اپنی تحریروں میں لطف پیدا کرتے ہیں۔جب کسی ہوٹل کا ذکر کرتے ہیں تو ہوٹل کے بارے میں اور وہاں پائی جانے والی تمام اشیاء کا بیان بھی کرتے ہیں۔جس سے ہوٹل کا پورا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔

---

(۱) ابن انشا.....آوارہ گرد کی ڈائری ۲۰۰۱.....ص ۳۰۴

دنیا گول ہے:

دنیا گول ہے، ابن انشا کا وہ سفر نامہ ہے جس میں انہوں نے مختلف ملکوں کے بارے میں اپنے تاثرات رقم کئے ہیں۔ اس سفر نامے کی ابتداء ۱۹۶۶ء سے ہوتی ہے جب وہ چین سے لوٹ کر آئے تھے اور پھر ایک ہفتہ پاکستان میں قیام کرنے کے بعد فلپائن کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔ یہ سفر بھی انہوں نے یونیسکو کی جانب سے ہی کیا تھا۔ وہ سب سے پہلے ٹوکیو گئے۔ جہاں تمام دنیا کے کتب سازوں کی ایک کانفرنس بلائی گئی تھی اور جہاں یونیسکو کی جانب سے ابن انشا نے اس کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ ۱۹۶۷ء کے جولائی مہینے میں اسی طرح کی ایک اور کانفرنس انقرہ میں بھی انعقاد پذیر ہوئی انہوں نے اپنے ملک کے نمائندہ کی حیثیت سے اس میں حصہ لیا۔ ۱۹۶۷ء ہی میں تین ماہ کی تربیت کے لئے انہیں مشرق وسطیٰ اور یورپ کے ممالک کا دورا کرنا پڑا۔ ۱۹۶۸ء میں خاندانی منصوبہ بندی (Family Planning) کے پروگرام کے سلسلہ میں ملیشیا، سنگاپور اور امریکہ کے شہروں سان فرانسسکو، شکاگو، واشنگٹن، سینٹ لوئی اور نیو یارک کی سیاحت کی۔

'دنیا گول ہے' کی شروعات اگر چہ ۱۹۶۶ء میں ہوئی لیکن اس کی پہلی اشاعت جون ۱۹۷۲ میں عمل میں آئی۔ یہ ''آوارہ گرد کی ڈائری'' کے ایک سال بعد چھپا۔ انہوں نے ''آوارہ گرد کی ڈائری'' کے دیباچہ میں ہی اس کی خوش خبری دے دی تھی:

> ''ان سفروں کی داستان طویل ہے اور چونکہ مشرق بعید،
> امریکہ اور یورپ سب کو محیط ہے، اس لئے اس کا نام ہم
> نے 'دنیا گول ہے' تجویز کیا ہے۔ یہ پڑھنے کے بعد جی
> چاہے تو اسے بھی پڑھئے''۔(۱)

'آوارہ گرد کی ڈائری' سے ماخوذ بالا اقتباس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ 'دنیا گول ہے' کی وجہ تسمیہ کیا

---

(۱) ابن انشا.....آوارہ گرد کی ڈائری (دیباچہ) ۲۰۰۱.....ص

ہے اور اس کا دائرہ کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ ڈاکٹر ریاض احمد ریاض نے اس کے دائرہ کار کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس میں فلپائن، انڈونیشیا، سنگاپور، ملیشیا، بنکاک، ہانگ کانگ، افغانستان، ترکی، جاپان، کوریا، لندن اور پیرس کے ساتھ ساتھ امریکی ریاست ہوائی کے علاوہ سان فرانسسکو کی سیاحت کا احوال درج ہے''۔(۱)

یہ سفرنامہ کسی ایک سفر کی روداد نہیں ہے، بلکہ اس میں کئی سفر کی روداد رقم کر دی گئی ہے، جس کی وجہ سے اس میں رنگارنگی اور بوقلمونی پیدا ہوگئی ہے ساتھ ہی اس کی ضخامت بھی متاثر ہوتی ہے۔ ضخامت کے اعتبار سے یہ ابن انشا کے تمام سفرناموں میں اولیت رکھتا ہے۔ ابن انشا نے اس سفرنامے سے متعلق لکھا ہے:

''یہ قاعدے سے صرف اس ایک سفر کی روداد پر بھی 'دنیا گول ہے' کا سفرنامہ لگ سکتا تھا لیکن کچھ فالتو بھی سفر ہم نے کر رکھے تھے، وہ بھی اس میں ملا دئے۔ یوں تو ہماری آوارگی ہمارے ۱۹۶۱ء کے سفر یورپ سے شروع ہوتی ہے۔ اور ۱۹۶۳ء میں ہم ایران سے فارسی بولتے اور ۱۹۶۴ء میں لنکا سے وہاں کے ملاحت مآبوں پر جان چھڑکتے لوٹے تھے، لیکن ۱۹۶۶، ۱۹۶۷ اور ۱۹۶۸ ہمارے لئے سیاحت کے بھرپور سال تھے۔ پورب اور پچھّم ہماری وحشت کا صحرا تھے''۔(۲)

'دنیا گول ہے' میں ابن انشا نے ان سفروں کا زیادہ تر ذکر کیا ہے جو بالکل ہنگامی نوعیت کے تھے اور

---

(۱) ریاض احمد ریاض.....ابن انشا احوال و آثار ۱۹۸۸.....ص ۶۹ ۷

(۲) ابن انشا.....دنیا گول ہے ۱۹۹۹.....ص ۱۱

انہوں نے جن جن جگہوں کی سیر کی تھی وہاں کے بارے میں پوری طرح سے جانکاری حاصل کرنے کے مواقع بھی انہیں دستیاب نہیں ہوئے تھے۔ لہذا اس سلسلے میں ڈاکٹر ریاض احمد ریاض لکھتے ہیں:

> ''سیاحت سے مراد یہاں وہ بھرپور سیاحت نہیں جہاں شہر اور مناظر بستیاں اور ساحل خود سیاح کے لئے جیتے جاگتے کردار بن جاتے ہیں اور اپنے سارے اسرار اس کی ذات پر منکشف کر کے اجنبیت کا ذرا بھی احساس باقی نہیں رہنے دیتے، یہاں تو کیفیت یہ ہے کہ ابن انشا کو جزیات کے مطالعے اور مشاہدے کی فرصت تو کیا، مناظر کو جی بھر کے دیکھنے کا موقع بھی نہیں ملا، کہیں اس کے پاس وقت کی کمی ہے تو کہیں زر مبادلہ کی جو یونیسکو والوں نے اسے کسی قدر خست سے کام لے کر عطا کیا ہے، اس لئے 'دنیا گول ہے' کے اکثر مقامات پر ابن انشا کے وقوف وقیام کا ذکر زیادہ ملتا ہے، ہوٹلوں اور ان کے غسل خانوں کا ذکر پہلے سے فزوں تر ہو گیا ہے۔ قدم قدم وہ کفایت شعاری کا مظاہر کرتے نظر آتے ہیں اور انہیں اپنے ڈالروں، فرانکوں اور لیروں کی فکر پڑی رہتی ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں اجنبی سرزمینوں کے بھرپور مشاہدے کی رنگارنگی نہیں۔ ظاہر ہے جب ان کے پاس بیرونی ممالک، وہاں کی تہذیبوں اور طرز بود و باش کو دیکھنے کا وافر وقت ہی نہیں تو ان کی سفر نوشت میں مشاہدات کی گہرائی کا عنصر کہاں سے آئے گا''۔(۱)

---

(۱) ریاض احمد ریاض.....ابن انشا احوال و آثار ۱۹۸۸.....ص ۷۶۹

ڈاکٹر ریاض احمد ریاض نے مذکورہ بالا اقتباس میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ابن انشا کے یہاں مشاہدات کی گہرائی کا عنصر نہیں ہے، لیکن یہ بات کلی طور پر صحیح نہیں ہے۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ ان کے دیگر سفرناموں کے مقابلے میں مشاہدات کا عنصر اس میں کم ہے۔ اس کے باوجود اس سفرنامے کے مطالعے سے ہمیں ان ملکوں اور شہروں کے بارے میں عمومی جانکاری مل جاتی ہے جن کا ذکر اس میں کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہاں کی تہذیب وتمدن کا بھی ہلکا سا عکس ان کے اس سفرنامے میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ سفرنامہ بھی قابل لحاظ ہے۔

'دنیا گول ہے' میں ابن انشا نے شگفتہ اور دلکش اسلوب کا استعمال کیا ہے۔ مزاح اس سفرنامے کی جان ہے اور اس کے لب ولہجہ پر یہ پوری طرح مسلط دکھائی دیتا ہے۔ اس کے صفحات پر کارٹون اور تصویریں بھی موجود ہیں جو اس کتاب کی زینت میں چار چاند لگاتے ہیں۔

'دنیا گول ہے' میں منظر کشی اور پیکر تراشی کے بھی اچھے اور نادر نمونے ملتے ہیں۔ ان کی شوخ نگاہ ایسے ہی مناظر پر جا کر ٹک جاتی ہے جن سے ان کے اسلوب میں مزاح کی کیفیت پیدا ہو جائے۔ یعنی کہ ان کی منظر کشی بھی انکے مخصوص انداز تحریر یعنی کہ مزاح نگاری کے لئے ہی مسالہ فراہم کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر ریاض احمد ریاض لکھتے ہیں:

> ''ابن انشا کی اس منظر کشی میں تھوڑا بہت مبالغہ بھی ہوگا لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ہمارے مزاح نگار ٹورسٹ کی شوخ نگاہ ایسے ہی مناظر پر زیادہ ٹکتی ہے اور اس کی شگفتہ نویسی اپنی نمود کے لئے جن عوامل وعناصر کی رہین منت ہے اس کا وافر مسالہ اسے ایسی ہی پر فضا جگہوں پر دستیاب ہوتا ہے۔ پھر اس کے اس تقابلی مطالعہ کی بھی داد دیجئے جہاں وہ کراچی والوں کی رہنمائی اور آسانی کے لئے

دریائے کابل کا اس گندے نالے سے موازنہ کرتا ہے جس
کے آغاز وانجام کے بارے میں اسے کچھ معلوم نہیں لیکن
اس بے خبری بلکہ بے نیازی کے عالم میں بھی اسے اتنا
ہوش ہے کہ یہ گرلز کالج کے قریب سے بہر حال گزرتا
ہے۔اب جب اتنی مشابہتیں اور تضاد جمع ہو جائیں تو عمدہ
اور شائستہ مزاج کیوں تخلیق نہ ہوگا؟ یہی ابن انشا کی مزاح
نگاری کا وہ مخصوص طریق کار اور ان کے اسلوب تحریر کا وہ
دل نشیں انداز ہے جو ایک شریر آئینے کے عکس کی طرح ہر
چیز کے حلیے کو مضحکہ خیز حد تک محض دھندلا ہی نہیں دیتا بلکہ
بگاڑ بھی دیتا ہے، لیکن چونکہ اس عکس کے اصلی ہونے میں
کلام نہیں ہوتا، اس لئے یہ ناہمواری ہمارے لبوں پر
مسکراہٹ لے آتی ہے''۔(۱)

الغرض 'دنیا گول ہے' میں ابن انشا نے اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے اور اس میں موضوع کی سطح پر بھی مایہ داری کا احساس ہوتا ہے۔لیکن اس میں تجربے ومشاہدے کے وہ عناصر شامل نہیں ہیں، جو کسی سفرنامے کو زیادہ اہمیت کا متحمل بناتے ہیں۔اس کے باوجود 'دنیا گول ہے' کی اہمیت اس لئے ہے کہ اس میں ابن انشا نے وہ طرز تحریر استعمال کیا ہے جو دل ودماغ کو فرحت اور شگفتگی بخشتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کمزور ہونے کے باوجود یہ سفرنامہ مقبول رہا ہے۔

---

(۱) ریاض احمد ریاض.....ابن انشا احوال وآثار ۱۹۸۸.....ص ۷۷۸

ابن بطوطہ کے تعاقب میں:

'ابن بطوطہ کے تعاقب میں' ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔ اس میں ۱۹۶۳ء کے سفر ایران اور ۱۹۶۴ کے سفر سری لنکا کے دوران لکھے گئے کالم شامل ہیں، ساتھ ہی اس میں انہوں نے اپنی عمر کے آخر سفر کی روداد یں بھی شامل کر دی ہیں۔ اس سلسلے میں خود ابن انشا فرماتے ہیں:

''اس مجموعے میں ہمارے سب سے پہلے دو سفر نامے بھی شامل ہیں، ایران (۱۹۶۳ء) کا سفر نامہ اور لنکا (۱۹۶۴ء) کا سفر نامہ، ایران کا سفر نامہ روز نامہ حریت میں چھپا تھا اور لنکا کا روز نامہ انجام میں۔ یہ دونوں ملک وہ ہیں، جہاں ابن بطوطہ گئے تھے۔ یہ ہمارے تازہ ترین سفروں کو بھی محیط ہے، یعنی جنوری ۱۹۷۴ء کا ٹوکیو اور ہانگ کانگ کا سفر بھی اس میں شامل ہے''۔(۱)

محولۂ بالا اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفر نامہ بھی کئی سفر ناموں کا مجموعہ ہے اور اخباری کالموں کی صورت میں پاکستان کے اخبار 'حریت' اور 'انجام' میں بالاقساط شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں انہیں کتابی شکل دے دی گئی ہے۔ ساتھ ہی اس میں حالیہ سفر یعنی کہ ٹوکیو اور ہانگ کانگ کی روداد بھی شامل کر دی گئی ہے۔ اس سفر نامہ کا نام 'ابن بطوطہ کے تعاقب میں' اس لئے رکھا گیا ہے کہ ایران اور سری لنکا وہ ممالک ہیں جن کی مٹی کو مشہور زمانہ سیاح ابن بطوطہ کے قدم چھو چکے ہیں۔

ابن بطوطہ کا شمار دنیا کے عظیم ترین سیاحوں میں ہوتا ہے۔ اس کی پیدائش مراکش میں ہوئی جس کی فضا خوشگوار اور پر امن تھی۔ لیکن چونکہ سیر و سیاحت اس کی جبلت میں داخل تھی اس لئے اس کو اپنے وطن کی خوشگوار اور پر امن فضا میں جی نہیں لگا اور اپنے شہر کو چھوڑ کر سیر و سیاحت پر نکل پڑا اور اپنی زندگی کا ایک

---

(۱) ابن انشا.....ابن بطوطہ کے تعاقب میں ۲۰۰۱.....ص ۱۵

بڑا حصہ غریب الوطنی میں گزرا۔ اس نے سفر کا آغاز کسی مقصد کی حصولیابی کے لئے نہیں کیا تھا بلکہ اس کے پیچھے اس کا ذوق تجسس کارفرما تھا۔ وہ ہمیشہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ بقول سید محمد کاظم پہاڑی کی اس طرف کیسی دنیا آباد ہے اور اسی جاننے کے شوق نے اسے سفر کے لئے رختِ سفر باندھنے کی طرف مائل کیا۔ وہ جب سفر کے لئے روانہ ہوا تو مسلسل سفر کرتا رہا اور اپنے گھر کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ریاض احمد ریاض لکھتے ہیں:

> ''ابن بطوطہ گھر سے نکلا تو اس نے پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ گھریلو زندگی کی آسودگی اور اہل وعیال کی محبت، غرض کوئی وابستگی اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں تھی۔ ابھی اس قدرتی سیاح نے لڑکپن کی سرحد پار کی تھی کہ مراکش سے حج بیت اللہ کے لئے مکہ مکرمہ پہنچ گیا، پھر قاہرہ، شام، عراق، جنوبی ایران۔ آذر بائیجان اور وہاں سے افریقہ ہوتا ہوا ہندوستان پہنچا۔ یہ اس کی سیاحت کی چھ منزلیں تھیں اور ابھی اس کی عمر بمشکل اکیس برس کے لگ بھگ تھی۔ ان سفروں میں اس نے اپنے اوپر یہ پابندی عاید کی تھی کہ ایک دفعہ وہ جس راہ سے گزر جائیگا دوبارہ وہ راہ بھی اختیار نہیں کرے گا۔ گویا سفر پسندی میں بھی تنوع اس کی فطرت میں شامل تھا۔(۱)

ابن بطوطہ کے احوال وآثار پر نگاہ ڈالنے کے بعد یہ بات یقین کے دائرے میں آجاتی ہے کہ سفر ہی اس کی زندگی تھی اور اس کے لئے وہ ہر طرح کی اذیتیں برداشت کرنے کو تیار تھا۔ اس نے سفر کسی مقصد کے

---

(۱) ریاض احمد ریاض.....ابن انشا احوال وآثار ۱۹۸۸.....ص ۷۸۷

حصول کے لئے نہیں کیا تھا بلکہ سفر اس کے خمیر میں شامل تھا۔لیکن اس کے برعکس ابن انشا کے احوال وآثار پر طائرانہ نگاہ ڈالنے کے بعد ہی یہ انکشاف ہونے لگتا ہے کہ ابن انشا کا سفر مقصد کے حصول کے لئے تھا، اس لئے ابن بطوطہ اور ابن انشا کا موازنہ کرنا ہی بیکار کی بات ہے۔ابن انشا کی کیا حیثیت تھی کہ وہ ابن بطوطہ کا تعاقب کرتے۔یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر ریاض احمد ریاض نے خالد اختر کے اس بیان پر تنقید کی ہے کہ 'مارکو پولو' اور 'ابن بطوطہ' کے بعد کے سیاحت کے میدان میں ابن انشا نے سکہ جمایا ہے۔ڈاکٹر ریاض احمد ریاض نے خالد اختر کے اس بیان کو مبالغہ آرائی سے تعبیر کیا ہے کہ 'مارکو پولو' وغیرہ ساری عمر میں دنیا کے ممالک کے اتنے دارالخلافوں میں نہیں گھومے پھرے جتنے دارالحکومتوں میں ابن انشا چند مہینوں میں گھوم آئے ہیں۔لہذا وہ اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

> ''چند مہینوں میں دنیا کے دارالسلطنتوں میں گھوم جانا ہی تو دراصل سیاحت کی روح کے منافی ہے۔ایک دو دن میں کوئی شہر اتنے تیز رفتار سیاح پر اپنے کتنے گوشے آشکار کرے گا! بالخصوص جب اس کا قیام بھی اونچے ہوٹلوں میں ہوا اور اس کی آسائش کے لئے ہر آسانی مہیا ہو یہی وجہ ہے کہ ابن انشا کے طویل سفروں کے باوجود ان کے کسی تجربے میں کوئی گہرائی نہیں۔حتّٰی کہ ماحول کی بھی پوری عکاسی موجود نہیں۔اسی لئے تو کہا جاتا ہے کہ کسی شہر، کسی بستی یا خطے میں سیاح کا قیام کم از کم اتنا تو ہو کہ وہ سرزمین اپنے اسرار اس پر منکشف کر سکے۔یہ اسرار تو اجنبی سرزمینوں پر چندے قیام اور وہاں کے اپنے بسنے والوں کے درمیان گھل مل کر رہنے ہی سے کھلتے ہیں''۔(۱)

---

(۱) ریاض احمد ریاض.....ابن انشا احوال وآثار ۱۹۸۸.....ص ۸۸۷۔۸۷۷

وہ مزید لکھتے ہیں:

''ابن انشا کا زیر مطالعہ سفرنامہ (ابن بطوطہ کے تعاقب میں) دراصل ان کی باقیات قسم کی چیز ہے کہ عوام میں اپنے سفرناموں کی مقبولیت دیکھکر انہوں نے اپنے اگلے پچھلے تمام سفری کالم اس میں یکجا کر دیے اور ساتھ ہی اپنے قارئین کو مطلع کر دیا کہ ''اب وہ کچھ دن چین کی سانس لے سکتے ہیں کیونکہ کتاب بھر کا مسالہ جمع کرنے کے لئے نئی سیاحتیں، چاہتیں اور ان کا سامان چاہئے۔''(۱)

ڈاکٹر ریاض احمد ریاض نے ''ابن بطوطہ کے تعاقب میں'' ادبی اہمیت پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ حالاں کہ یہ سفرنامہ بھی اپنی نوعیت کا ایک اہم سفرنامہ ہے اور اس میں بھی وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ان کے دیگر سفرناموں میں موجود ہیں۔ اس کی حیثیت باقیات کی بھی نہیں ہے جیسا کہ ریاض احمد کا کہنا ہے۔ اگر اس کی حیثیت باقیات کی ہوتی تو اسی پر ان کے سفرناموں کا اختتام ہو جاتا اور ''نگری نگری پھرا مسافر'' کا معرض وجود میں نہیں آتا۔ اگر اس میں وہ ادبی چاشنی موجود نہیں ہے جو ان کے دیگر سفرناموں میں ہے تو بھی کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ ایک فنکار ہمیشہ یکساں معیار کی چیزیں نہیں لکھتا ہے، وقت و حالات اور واردات و کیفیات کے مطابق فن پارے کے معیار و اقدار بھی متاثر ہوتے ہیں اگر ابن انشا نے اپنے قارئین کو مطلع کرتے ہوئے اس سفرنامے کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ کتاب بھر کا مسالہ جمع کرنے کے لئے نئی سیاحتیں چاہئیں اور ان کا سامان چاہئے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں نکلتا ہے کہ اس میں بھرتی کی مواد شامل کر دیے گئے ہیں۔ جو کچھ بھی اس میں شامل کیا گیا اس کا کچھ نہ کچھ Relevency ضرور ہے۔

ابن انشا کا جوہر فن دراصل ان کے سفرناموں کے اسلوب سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے سفرناموں

---

(۱) ریاض احمد ریاض.....ابن انشا احوال و آثار ۱۹۸۸.....ص ۸۸ے

میں مواد سے زیادہ اسلوب کی اہمیت ہے اور یہ بات ''ابن بطوطہ کے تعاقب میں''، میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس میں بھی ان کی تحریر کی شگفتگی بدرجہ اتم دکھائی دیتی ہے۔ ''ابن بطوطہ کے تعاقب میں'' کی اسلوبیاتی خصوصیات کو زیر خط کرتے ہوئے خود ڈاکٹر ریاض احمد ریاض فرماتے ہیں:

> ''بلاشبہ یہ دلچسپ اسلوب بیان ابن انشا جیسے مزاح نگار کا ہی حصہ ہے، بلکہ دراصل یہی ان کا اصل فن ہے جسے ہم طنز وظرافت کی پرکھ کی ہر کسوٹی پر پورا اترتا دیکھتے ہیں..... بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ طنز ومزاح کا یہ شگفتہ امتزاج ابن انشا ہی سے خاص ہے۔''(۱)

زیر مطالعہ کتاب کا آخری جزو جو کہ لنکا اور ایران کے سفر پر مشتمل ہے، اس کتاب کی جان بھی ہے اور ان کے سفرنامے کا اشاریہ بھی۔ یہ وہ حصہ ہے جو کہ ان کے سابقہ سفروں سے متعلق ہے اور جس کو ریاض احمد ریاض نے باقیات کا نام دیا ہے حالاں کہ انہوں نے ایک جگہ اسی حصے کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''لنکا اور ایران کے سفر پر مشتمل کتاب کا یہ آخری حصہ بلاشبہ سفرنامہ نگاری کی تکنیک سے نسبتاً زیادہ قریب ہے، اس میں مصنف کے مشاہدے کی قوت فی الحال اس کے حسن مزاح پر حاوی ہے اور زبان وبیان کی دلچسپی کے ساتھ ساتھ اس کی سفر کہانی میں مربوط اور خوشگوار بیانیہ Narrative کا انداز موجود ہے''۔(۲)

مجموعی حیثیت سے 'ابن بطوطہ کے تعاقب میں' ابن انشا کا کامیاب سفرنامہ ہے جس میں زبان وبیان کی خوبی قارئین کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔

---

(۱) ریاض احمد ریاض.....ابن انشا احوال وآثار ۱۹۸۸.....ص ۷۹۰-۷۸۹

(۲) ایضاً.....ص ۷۹۵

نگری نگری پھرا مسافر:

''نگری نگری پھرا مسافر'' ابن انشا کا آخری سفر نامہ ہے جو ان کے سفر آخرت کے بعد منصۂ شہود پر آیا۔ اس کا نام بھی انہوں نے خود نہیں رکھا تھا بلکہ ان کے چھوٹے بھائی محمود ریاض نے رکھا تھا۔ ''نگری نگری پھرا مسافر'' کے فلیپ میں محمود ریاض نے اس کتاب سے متعلق ساری معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''انشا بھائی جان کے سفرناموں میں یہ آخری سفر نامہ ہے۔ یہ سفر نامہ انہوں نے ۷۶ء میں خود مرتب کیا اور کتابت کروایا۔ اور جنوری ۷۷ء میں لندن جاتے وقت کتابت شدہ ساتھ لے گئے تھے۔ جولائی ۷۷ء میں جب میں ان سے ملنے کے بعد لندن سے واپس لوٹ رہا تھا تو انہوں نے یہ سفر نامہ اور اس سفر نامہ کے ساتھ اپنے دیرینہ دوست مشہور کارٹونسٹ بی۔ اے۔ نجمی کے نام ایک خط لکھ کر دیا کہ سفر نامے کے لئے کارٹون بنادے۔ جنوری ۷۸ء میں انشا جی ہم سے جدا ہو گئے اور کئی سال تک یہ سفر نامہ میرے پاس رکھا رہا۔ پھر میں نے اسے خط سمیت نجمی صاحب کے حوالے کر دیا۔ نجمی صاحب خط پڑھکر افسردہ ہو گئے تاہم انہوں نے کارٹون بنا کر دینے کا وعدہ کر لیا لیکن اس وعدے کے ایفا میں بھی کئی سال لگ گئے۔ بالآخر انہوں نے انشا جی کے لکھے ہوئے اشاروں کو مدنظر رکھتے ہوئے کارٹون بنا دیئے''۔(۱)

---

(۱) ابن انشا.....نگری نگری پھرا مسافر.....فلیپ سے ۲۰۰۱

اب..... یہ سفرنامہ آپ کی خدمت میں پیش ہے، وہ شگفتگی ، وہ اسلوب ، وہ رنگ جو ان کے سفرناموں کا خاصہ ہے، اس میں بھی موجود ہے۔

اس سفرنامے کا نام انہوں نے نہیں رکھا تھا۔ وہ اس بار لندن گئے تو پھر واپسی کا راستہ یاد نہ آیا۔ تب مجھے میراجی کا وہ شعر یاد آیا:

نگری نگری پھرا مسافر
گھر کا رستہ بھول گیا

اس لئے میرے نزدیک ''نگری نگری پھرا مسافر'' سے بہتر کوئی نام نہ تھا''۔

اس سفرنامے کا پیش لفظ خواجہ محمد زکریا نے لکھا ہے۔ پیش لفظ میں خواجہ صاحب نے انشا جی کے فن پر مدلل گفتگو کی ہے انہوں نے یہ لکھا ہے کہ اس سفرنامے میں زیادہ حصہ جاپان جیسے ترقی یافتہ صنعتی ملک کے بارے میں ہے، جو کتاب کے مطالعہ سے بھی ظاہر ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس میں روس اور لندن کا بھی ذکر ملتا ہے۔

اس کتاب کا ایک بڑا حصہ جو کہ جاپان کے بارے میں ہے، میں انہوں نے وہاں کے دو بڑے شہروں ٹوکیوں اور کیوٹو کی صورت حال پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ صنعتی اعتبار سے اگرچہ جاپان بہت ہی ترقی یافتہ ملک ہے، لیکن وہاں بھی ایشیائی ممالک کی تمام باتیں موجود ہیں۔ یعنی کہ وہاں بھی چوری چکاری ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے وہاں کے تمدن پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جاپان میں اب کے ہمیں وطن عزیز بہت یاد آیا۔ ایک روز تو بہت ہی یاد آیا۔ ہائے یہاں کی آزادی کہ کوئی روکنے والا نہیں، کوئی ٹوکنے والا نہیں۔ سگریٹ کا ٹکڑا تو خیر معمولی چیز ہے۔ آپ کسی بھی دفتر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کسی

بھی سنیما کے غسل خانے میں ہاتھ دھوتے ہوئے دیوار پر
پان کی پیک پھینک سکتے ہیں۔ دوسرے ملکوں میں یہ ہے
کہ راستہ چلتے میں کوئی ضروری حاجت تنگ کرے تو غسل
خانہ ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ 'جنٹلمین' کا نشان دیکھنا پڑتا ہے۔
یہاں ذرا اک گردن جھکائی اور کسی بھی دیوار کے سائے
میں بیٹھ گئے۔ ناک ہر شخص کی اپنی ذمے داری ہے۔ آپ
اپنی ناک پر رومال رکھ لیجئے۔ پاس سے گزرنے والا اپنی
ناک پر رکھ لے گا۔ خواہ مخواہ لوگ ایک ذاتی مسئلے کو
معاشرتی مسئلہ بناتے ہیں دوسرے ملکوں میں'' (۱)

ابن انشا نے اس سفرنامے میں کسی شہر کے تمدن پر خامہ فرسائی کی ہے تو اس کے ایک ایک گوشے کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے اس سفرنامے میں افراد سے لے کر سماج تک کے سارے معاملات وواقعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے وہاں کے نظام معاشرت کے عام سے عام پہلو کو اجاگر کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ وہ جاپان کی ٹریفک پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ٹریفک بہت ہے لیکن ٹریفک کے حادثے اتنے نہیں
ہیں۔ دو گاڑیاں لڑ جائیں تو فریقین پہلے تو اتر کر ایک
دوسرے کو جھک کر تعظیم دیتے ہیں۔ فوراً ایک دوسرے کے
شجرۂ نسب میں نقص نکالنے نہیں بیٹھ جاتے نہ ایک
دوسرے کی گردن میں ہاتھ دیتے ہیں۔ نہ مجمع لگتا ہے۔

---

(۱) ابن انشا.....نگری نگری پھرا مسافر ۲۰۰۱.....ص ۲۳

دونوں ایک دوسرے کی گاڑی کا جائزہ لیتے ہیں اور ستر اسّی
فی صدی صورتوں میں وہیں تصفیہ ہو جاتا ہے۔ قصور وار
آدمی یا تو زرِ نقد دے دیتا ہے یا اپنے نام کا کارڈ کہ مرمت
کرالو اور بل مجھے بھیج دو''۔(۱)

جس طرح انہوں نے مذکورہ سفرنامے میں جاپان کی معاشرت کا ایک مکمل نقشہ کھینچا ہے اسی طرح لندن اور روس کے تہذیب وتمدن سے بھی ہمیں آشنا کرایا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ابن انشا کا یہ سفرنامہ بھی ان کے دوسرے سفرناموں کی طرح مختلف ممالک کے روز وشب کا گوشوارہ ہے جس کے مطالعہ سے وہاں کا طرز معاشرت ہماری آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ لہذا وہ لندن کی دکان کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

یوں تو لندن میں پہلے بھی کوئی چیز اصل قیمت پر نہ ملتی تھی۔
دکان دار صاف کہہ دیتا تھا کہ حضرت اصل قیمت سے کم پر
لینی ہے تو لیجئے ورنہ کوئی اور دکان دیکھئے۔ ہر چیز پر
دو قیمتوں کی پرچی لگی رہتی تھی۔ ایک اصل قیمت
یا کارخانے کی قیمت۔ دوسری دکان ہذا کی رعایتی قیمت
فروخت بلکہ بالعموم تو دکان دار کو خود پرچی لگانی نہیں
پڑتی۔ کارخانے والا پیکٹ پر ہی چھاپ دیتا ہے کہ اس
صابون میں پانچ پنس رعایت ہے، اس ٹوتھ پیسٹ میں
تین پنس کی کمی۔ لیکن آج بھی تو اس شہر میں سیل کی گنگا بہہ
رہی ہے، اور اس گنگا میں ہاتھ دھونے اور نہانے کے لئے

---

(۱) ابن انشا.....نگری نگری پھرا مسافر ۲۰۰۱.....ص ۲۴ تا ۲۶

پوری دنیا کے سیاح پہنچے ہوئے ہیں۔ آکسفورڈ اسٹریٹ پر
جسے دنیا کا سب سے بڑا شاپنگ سینٹر کہا جاتا ہے کھوے
سے کھوا چھلنے کی بات نہیں، ہجوم میں تھالی پھینکئے تو سر ہی سر
جائے۔''(۱)

''نگری نگری پھرا مسافر'' میں بھی اسلوب کی وہی شگفتگی موجود ہے جو ان کے دیگر سفرناموں کا خاصہ ہے۔ یعنی کہ اس کے اسلوب میں بھی طنز و مزاح نے گلکاریاں کی ہیں۔ ابن انشا کے تمام سفرناموں کا مجموعی جائزہ لینے کے بعد یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ ابن انشا اپنی نوعیت کے واحد سفرنامہ نگار ہیں جن کا لب ولہجہ اردو کے دیگر سفرنامہ نویسوں سے بالکل ہی مختلف اور جداگانہ ہے۔ وہ زبان پر مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لفظوں کے الٹ پھیر سے بھی اپنے لہجے کو شگفتہ بنا لیتے ہیں۔ ساتھ ہی ان کی تحریروں میں جملے کی ساخت بھی بڑی حسین اور فطری ہوتی ہے او کہیں بھی تصنع اور تکلف کا گمان نہیں ہوتا جس سے یہ باور کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ زبان کا بامحاورہ استعمال کرنے پر ابن انشا کو پوری دسترس حاصل ہے۔

ابن انشا کے سفرناموں میں ایک اور بات جو دیگر سفرنامہ نگاروں میں نہیں پائی جاتی وہ ہے کہ وہ سفر نامے کو ایک نیا آہنگ دیتے ہیں جس سے ان کے سفرنامے ادب کی ایک نئی صنف معلوم ہوتے ہیں۔ ابن انشا کے سفرناموں پر گفتگو کرتے ہوئے خواجہ محمد زکریا نے سچ ہی کہا ہے کہ ''انہوں نے سفرنامے اور طنز و مزاح کو یکجا کر کے ان دونوں سے ایک نئی صنف ادب تشکیل دی ہے، سفرنامہ ہے (۲)

---

(۱) ابن انشا.....نگری نگری پھرا مسافر ۲۰۰۱.....ص ۱۹۰

(۲) ایضا.....ص ۷

حاصل کلام

حاصل کلام

ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے اور اس آئینے میں زندگی کی تلخ و شیریں سچائیاں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ ایک ادیب اپنے گرد و پیش سے جو کچھ حاصل کرتا ہے اسی کو حیطۂ تحریر میں لاتا ہے۔ بقول ساحر لدھیانوی

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

سفرناموں پر یہ بات پوری طرح صادق آتی ہے، کیونکہ سفرنامے میں داخل سے زیادہ خارج کا اظہار ہوتا ہے، یا یوں کہئے کہ اس میں داخل کی حیثیت ثانوی درجے کی ہوتی ہے، خارج ہی اپنی پوری توانائی کے ساتھ اس کے کینوس (Canvas) پر چھایا ہوتا ہے۔ سفرنامہ سفر کی روداد تو ہوتا ہے، لیکن اسے روداد محض نہیں سمجھنا چاہئے، اس کے پس پشت اس میں سفرنامہ نگار کا نقطۂ خیال اور زاویۂ نظر بھی شامل ہوتا ہے۔ سفرنامہ نگار کسی واقعہ، حادثہ یا منظر سے جو اثر قبول کرتا ہے اس میں اس کی افتادِ طبع کی کارفرمائی یقیناً ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک واقعہ، ایک حادثہ یا ایک منظر سے ایک ہی وقت میں کئی سفرنامہ نگار مختلف و متضاد اثرات قبول کرتے ہیں۔

سفرنامہ نگاری کی ابتدا انیسویں صدی کے نصف اول کے آخری عشرے میں ہوتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے بھی ادب میں اس کے نقوش ملتے ہیں۔ اردو مثنویوں میں روداد سفر کی بہتات ہے۔ ہیرو اپنے مقصود و محبوب کی تلاش میں بار بار قصد سفر کرتا ہے اور سفر کی پریشانیوں سے دوچار ہوتا ہے۔ مثنویوں کے علاوہ داستانوں میں بھی سفرنامے کے عناصر ملتے ہیں۔ لیکن بحیثیت صنف اس کا تعارف انیسویں صدی کے نصف اول کے آخری عشرے میں ہی ہوتا ہے۔

ابتداء سے لے کر اب تک اردو میں بے شمار سفرنامے لکھے گئے۔ سفرنامہ نگاری بھی اردو کی دیگر

اصناف کی طرح ایک آزاد صنف ہے اور اس کی حیثیت مسلم ہے، اس کے باوجود اس پر خاطر خواہ تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ سفرنامے پر جو کتابیں بازار میں دستیاب ہیں، انہیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سفرنامہ جیسے اہم اور کلیدی موضوع کو نظر انداز کیا گیا۔ اردو تنقید کا بیشتر حصہ شاعری اور فکشن کی نذر ہو کر رہ گیا، حالاں کہ سفرنامہ نگاری پر بھی خصوصی توجہ دی جانی چاہئے۔

بہر حال، اردو کے سفرناموں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کا شدت کے ساتھ احساس ہونے لگتا ہے کہ ان میں ذات کے ساتھ ساتھ کائنات بھی شامل ہے یا کائنات کے ساتھ ساتھ ذات بھی شامل ہے۔ سفرنامہ بھی ادب کی دیگر اصناف کی طرح ذات و کائنات کے مختلف و متنوع مناظر و مظاہر کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے نظر آتا ہے۔

سفرنامہ کا ایک معتد بہ حصہ عقیدت مندانہ جذبے سے مملو نظر آتا ہے۔ یہ سفرنامے دراصل مذہبی نوعیت کے ہیں۔ ان میں زیادہ تر وہ سفرنامے شامل ہیں جو زیارتِ حرمین شریفین کے موقع سے لکھے گئے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ غیر مذہبی سفرناموں کی تعداد بھی کم نہیں۔ اردو میں بہت اور اچھے غیر مذہبی سفرنامے لکھے گئے۔ ان سفرناموں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ان کے ذریعہ جغرافیائی حدود کے ساتھ ساتھ تاریخ و تہذیب کا علم بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ سفرنامہ کا کینوس بہت ہی وسیع ہوتا ہے۔ اس میں سفر کی روداد کے حوالے سے دیگر موضوعات کو بھی شامل کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔

سفرنامہ نگاری ایک مشکل فن ہے۔ ایک سفرنامہ نگار کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ جن مقامات کی سیر پر گیا ہو ان کے بارے میں پوری معلومات رکھتا ہو، ان کے بیان کرنے کی بھی اس میں پوری صلاحیت موجود ہو۔ وہ دوران سفر جن واقعات و حادثات سے دوچار ہوا ہو ان کی جزئیات پر بھی اس کی نگاہ ہونا لازم ہے، کیونکہ اسی سے سفرنامے کے اندر دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ اگر کوئی سفرنامہ نگار واقعات و حادثات کی جزئیات کے بیان سے قاصر ہے تو اسے کامیاب سفرنامہ نگار نہیں مانا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ سفرنامے میں زبان کا بھی خوبصورت استعمال ہونا ضروری ہے۔ کیوں کہ اگر اس میں زبان کا

خوبصورت استعمال مفقود ہوگا تو دلچسپی کا سامان پیدا نہیں ہو پائے گا۔

ابن انشا کے سفرناموں پر عمیق نگاہ ڈالنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان سفرناموں میں ایک کامیاب سفرنامے کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ ابن انشا نے جو سفرنامے لکھے ہیں ان کی ادب میں ایک خاص اہمیت ہے، کیونکہ یہ اپنی نوعیت کے منفرد و ممتاز سفرنامے ہیں۔ ابن انشا ایک کثیر الجہات شخصیت کا نام ہے۔ انہوں نے بیک وقت ادب کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ وہ شاعر بھی تھے اور ادیب بھی۔ انہیں اچھی شاعری بھی کرنا آتی تھی اور اچھی نثر بھی لکھنی آتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سفرناموں میں زبان کا برمحل استعمال ملتا ہے۔ ان کی نثر کی زبان میں بھی شعریت پائی جاتی ہے۔ اس میں ایک فطری رچاؤ موجود ہے جس سے فصاحت اور سلاست کی بھینی بھینی خوشبو آتی محسوس ہوتی ہے۔ ابن انشا نے اپنے سفرناموں میں علمی نثر کا استعمال کہیں نہیں کیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی اثر انگیزی دوبالا ہوگئی ہے۔

زبان کے ساتھ ساتھ ابن انشا کے سفرناموں کی سب سے بڑی خوبی ان کا دلکش اسلوب ہے۔ ابن انشا نے اپنے سفرناموں میں جو اسلوب استعمال کیا ہے اس کی نظیر اردو سفرنامے کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ ابن انشا ایک زندہ دل انسان تھے اور ہنسانا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سفرناموں میں طنز و مزاح کا عنصر جگہ جگہ ملتا ہے۔ وہ زندگی کی کرخت حقیقت کو طنز و مزاح کے ذریعہ قابل قبول بنا دیتے ہیں۔ ابن انشا کے طنز و مزاح میں ابتذال کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ وہ طنز و مزاح کو اس سلیقے سے اپنی تحریروں کا عنصر بنا دیتے ہیں کہ اس میں ادب کا وقار برقرار رہتا ہے، ساتھ ہی ان کے مطلب کی ادائیگی بھی ہو جاتی ہے۔ ان کی ظرافت میں فن کی پوری عظمت مضمر ہے جس کے باعث قارئین فرحت و انبساط کے دریائے ناپیدا کنار میں غرق ہو کر رہ جاتے ہیں۔

ابن انشا نے اپنے سفرناموں میں کالم کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ ان کے سفرنامے کالموں کی ترتیب و تنظیم سے وجود میں آئے ہیں لیکن انہوں نے ان کالموں کی ترتیب و تنظیم میں حد درجہ کی فنکاری دکھائی ہے۔ واقعات کے ربط و تسلسل کی کمی ان کے سفرناموں میں کہیں بھی نہیں کھٹکتی ہے۔ ترتیب و تنظیم ان

کے سفرناموں کی ایک اہم خوبی کے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے۔

ابن انشا کے سفرناموں کا بہ نظر تعمق مطالعہ کرنے کے بعد یہ شق بھی ابھرتی ہے کہ انہوں نے اپنے سفرناموں میں سفرنامہ اور طنز ومزاح دونوں کے عناصر شامل کر دئے ہیں. کبھی یہ سفرنامہ لگتے ہیں اور کبھی فکاہیہ نثر۔ بہ الفاظ دیگر ان کے سفرنامے سفرنامہ بھی ہیں اور فکاہیہ نثر بھی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ناقدین کا یہ خیال ہے کہ ابن انشا طنز ومزاح اور سفرنامے کے امتزاج سے ایک نئی صنف ادب تخلیق کرتے ہیں۔ اس طرح ابن انشا کو ایک نئی صنف ادب کا موجد ومؤسس بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

ابن انشا کو سفر سے بہت زیادہ رغبت تھی۔ انہوں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ سیر وسیاحت میں صرف کیا تھا۔ ان کی سفر پسندی کا عکس ان کی شاعری میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہم جنگل کے جوگی ہم کو ایک جگہ آرام کہاں
آج یہاں کل اور نگر میں صبح کہاں اور شام کہاں
جنگل جنگل شوق سے گھومو دشت کی سیر مدام کرو
انشا جی ہم پاس بھی لیکن رات کی رات قیام کرو
شہروں میں پھرے سنیاس لئے جنتا کو جگت بھگوان کہے
انشا سا کوئی رمتا دیکھا کہنے کو ہیں جوگی ہر بن میں

ابن انشا کے اکثر سفرنامے وقتی اور ہنگامی حالات میں لکھے گئے۔ یہ اخباری کالموں کی صورت میں لکھ کر پاکستان کے اخبار میں بغرض اشاعت ارسال کر دئے جاتے تھے۔ ظاہر ہے ایسی تحریروں میں ادبیت کا فقدان ہونا فطری بات ہے، لیکن اس کے باوجود ان کی تحریروں میں ایک ادبی شان پائی جاتی ہے۔ ابن انشا کا اسلوب شگفتہ ہے۔ ان کی تحریروں میں جو جملہ بازی اور فقرہ طرازی ملتی ہے اس سے ایک خوشگوار فضا تیار ہو جاتی ہے۔ ابن انشا کے اسلوب پر میر انیس کا یہ شعر صادق آتا ہے:

دم تحریر گل ریزی ہے یا سطریں ہیں کاغذ پر
صریر کلک ہے یا باغ میں بلبل چہکتا ہے

کتابیات

بنیادی ماخذ

ابن انشا	دنیا گول ہے	ساقی بک ڈپو دہلی	۱۹۹۹
؍؍	نگری نگری پھرا مسافر	کتاب والا ۴۹۔۲۷ گلی جھوت والی پہاڑی بھوجلہ دہلی	۲۰۰۱
؍؍	چلتے ہو تو چین کو چلیے	؍؍	
؍؍	آوارہ گرد کی ڈائری	؍؍	
؍؍	ابن بطوطہ کے تعاقب میں	؍؍	

ثانوی ماخذ

مصنف/مرتب	کتاب	مقام اشاعت	سن اشاعت
ابن انشا	اردو کی آخری کتاب	کتاب والا ۴۹۔۲۷ گلی جھوت والی پہاڑی بھوجلہ دہلی	۲۰۰۱
؍؍	سحر ہونے تک	سنگم پبلشرز لاہور	۱۹۴۶
؍؍	خمار گندم	لاہور اکیڈمی لاہور	۱۹۸۰
؍؍	اس بستی کے ایک کوچہ میں (مجموعہ کلام)	؍؍	۱۹۸۰
؍؍	چاند نگر (مجموعہ کلام)	عاکف بک ڈپو دہلی	۱۹۹۸
انور سدید	اردو ادب میں سفرنامے	مغربی پاکستان اردو اکادمی لاہور	۱۹۹۲
اے حمید	ابن انشا یادیں باتیں	شیخ غلام علی پریس لاہور	۱۹۸۰
ابوالخیر کشفی	ہمارا عہد ادب اور ادیب	قمر کتاب گھر کراچی	۱۹۷۱

اعجاز حسین	نئے ادبی رجحانات	کتابستان الہ آباد	۱۹۵۷
انور سدید	اردو ادب کی مختصر تاریخ	اردو کتاب گھر کراچی	۱۹۹۶
بشریٰ رحمٰن (ڈاکٹر)	اردو کے غیر مذہبی سفرنامے	شاندار پریس جامع مسجد پورب پھاٹک گورکھپور	۱۹۹۹
حامد بیگ	اردو سفرنامہ کی مختصر تاریخ	مقتدرا قومی زبان اسلام آباد	۱۹۸۷
خالد محمود	اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی	۱۹۹۵
خواجہ الطاف حسین حالی	حیات جاوید	ترقی اردو بیورو نئی دہلی	۱۹۸۲
خواجہ حسن نظامی	سفرنامہ ہندوستان	دلی پرنٹنگ ورکس دہلی	۱۹۴۳
؍	سفرنامہ پاکستان	؍	۱۹۵۲
ریاض احمد ریاض	ابن انشا احوال و آثار	انجمن ترقی اردو پاکستان	۱۹۸۸
سید عاشور کاظمی	بیسویں صدی میں اردو نثر نگار مغربی دنیا میں	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	۲۰۰۲
شبلی نعمانی	سفرنامہ روم و مصر و شام	دارالمصنفین اعظم گڑھ	
صبیحہ انور	اردو میں خودنوشت سوانح حیات	لکھنؤ	۱۹۸۲
قدسیہ قریشی	اردو سفرنامے انیسویں صدی میں	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی	۱۹۸۷
قطب النسا ہاشمی	اردو سفرنامے	مقتدرہ قومی زبان کراچی	۱۹۸۸
محمد نسیم	اردو ناول پر تقسیم ہند کے المیہ کے اثرات	بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ	۲۰۰۲
منظر اعظمی	اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ	اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ	۱۹۹۶
وزیر آغا	اردو ادب میں طنز و مزاح	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۲۰۰۳

رسائل و جرائد

ماہنامہ شب خون الہ آباد	شمارہ ۴۲	۱۹۶۹
ماہنامہ حنا (انشا نامہ) لاہور	اپریل	۱۹۷۱
ماہنامہ حنا (انشا نامہ) لاہور	مارچ	۱۹۸۱
سہ ماہی شیپ کراچی	شمارہ ۱۲، ۱۴۔۱۶	
ماہنامہ کتاب (ابن انشا کی یاد میں) لاہور	فروری	۱۹۷۸
ماہنامہ فنون لاہور	اکتوبر نومبر	۱۹۷۱
ماہنامہ فنون (چلتے ہو تو چین کو چلیے تبصرہ فتح محمد ملک)		۱۹۶۸
ماہنامہ مجلّہ نقوش (سفر نامہ کی فنی بحث از انور سدید) لاہور	ستمبر	۱۹۸۲

Jawaharlal Nehru University Library

IBNE INSHA KE SAFAR NAMON KA TAJZIYATI MOTALEA

Dissertation submitted to the Jawaharlal Nehru University in partial fulfillment of the requirements for the award of the degree of

Master of Philosophy

By
OBAIDUL GHAFFAR

Under the supervision of
PROF. MOHD. SHAHID HUSAIN

Centre of Indian Languages
School of Language, Literature and Culture Studies
Jawaharlal Nehru University
New Delhi- 110067
2005